WAMIQ JAUNPURI

LIFE AND LITERARY WORKS

Thesis Submitted for the award of the degree of

Doctor of Philosophy

IN

URDU

By

NISHAT AFROZ

UNDER THE SUPERVISION OF

Dr. QAISAR JAHAN

PROFESSOR & CHAIRPERSON

DEPARTMENT OF URDU

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

ALIGARH (INDIA)

Dec. 2002

وامق جون پوری - حیات اور ادبی کارنامے

مقالہ برائے پی ایچ - ڈی.

تلخیص

نگراں

ڈاکٹر قیصر جہاں

پروفیسر و صدر شعبۂ اردو

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

مقالہ نگار

نشاط افروز

T-5963

شعبۂ اردو

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ، یوپی، انڈیا

دسمبر ۲۰۰۲ء

T-5963

تلخیص

تلخیص

وامقؔ جونپوری ترقی پسند تحریک کے ان شعراء میں ہیں جنھوں نے اسے دل ودماغ دونوں طرح سے قبول کیا تھا ان کی شاعری عام انسانی مسائل اور سماجی ناہمواریوں کے خلاف ایک پرزور اور دردمند احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے پارٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے کام انجام دیا اور قحط بنگال کی صورت حال پر وہاں جا کر نظم لکھی ساتھ ہی ساتھ وہ نثر میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ ترقی پسند تحریک کے بعض مشہور ومعروف لوگوں نے ان کو وہ اہمیت نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح ''گفتنی ناگفتنی'' میں ان تمام باتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

وامقؔ کی کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت ان کے ساتھیوں کے لئے عجیب سی تھی۔ وامق ایک متمول اور زمیندار گھرانے کے آدمی تھے لوگوں کا خیال تھا کہ ترقی پسند تحریک، جو کمیونسٹ تحریک کی ایک جزو رہی ہے اور مکمل طور پر غریب ومزدور، عوام اور پسماندہ طبقہ کی حمایتی ہے۔ بھلا ایک بڑے گھر کا لڑکا ایسی تحریک کا ساتھ کیسے دے سکے گا؟ مگر وامق ایسی باتوں سے بددل نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے پورے عزم وحوصلے کے ساتھ ایسی باتوں کو اپنے لئے گائڈ لائنس (Guide lines) بنالیں۔ انھوں نے اپنے عملی اقدام سے یہ ثابت کردیا کہ وہ پارٹی کے لئے اہل بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں ان ساتھیوں کے خدشات غلط نکلے۔

وامقؔ جونپوری کا پورا نام سید احمد مجتبیٰ زیدی ہے۔ ان کے بزرگ وار زمیندار تھے زمینداری اور سرکاری نوکری یہ اس زمانہ کی دو گراں قدر چیزیں تھیں جو کسی خاندان کو امتیازی شان

عطا کرتی تھیں۔

وامقؔ ضلع جونپور کے موضوع ٹیڑھواں جوزبان خاص میں کجگاؤں ہے وامق اسی کجگاؤں میں ۲۳/اکتوبر ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے اور یہیں کی گلیوں میں انھوں نے اپنا بچپن گزارا۔

وامق نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کیا بعد میں انھوں نے علی گڈھ اور کشمیر یونیورسٹی میں ملازمت کی جوانھیں راس آئی اوران کی شاعری پروان چڑھی۔

میں نے وامق جونپوری کو اپنی تحقیق کا موضوع اس لئے بنایا ہے کہ اس شاعر کا صحیح مرتبہ ومقام متعین کیا جاسکے اوراس کوتاہی کا ازالہ ہوسکے جو وامق جونپوری کے ہمعصرادیبوں نے ان کے ساتھ روارکھی۔

میرا یہ مقالہ مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

۱- جونپور کا ادبی پس منظر

۲- وامق جون پوری کے سوانحی حالات

۳- اردو میں ترقی پسند تحریک کا پس منظر

۴- وامق جون پوری کی نظمیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ

۵- وامق جونپوری کا نظریہ شعر

۶- وامق کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

۷- خودنوشت سوانح (گفتنی ناگفتنی) کے حوالے سے وامق کی نثرنگاری کا جائزہ

۸- اردوادب میں وامق کا مقام

باب اول: جون پور کا ادبی پس منظر :

ابتدائے زمانہ سے آج تک اس دنیا میں نہ جانے کتنی تہذیبوں نے جنم لیا اور اپنا ایک شاندار ماضی چھوڑ کر تاریخ کے صفحات میں گم ہوگئیں، اور نہ جانے کتنی قوموں کے عروج وزوال کو

تاریخ بھی اپنے صفحات میں نہ سموسکی کیونکہ اس وقت خود فن تاریخ کا وجود نہ تھا۔

تاریخ میں قدیم تہذیبوں میں یونان، مصر اور روما وغیرہ کی تہذیبوں کا چرچا ملتا ہے ہندوستان کتنا قدیم اور اس کی تہذیب کتنی عظیم ہے اس کی شہادت موہن جوداڑو اور ہڑپا کے کھنڈرات، اجنا ایلورا کے باقیات، وادی سندھ اور اشوک کے دور کے تہذیبی آثار ونشانات بانگ دہل کہہ رہے ہیں۔ دلکشی ودلفریبی اور ہر طرح کی فارغ البالی کے لحاظ سے ہندوستان دنیا کا واحد ملک رہا ہے جس کی کوئی مثال تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں ملتی اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے آج تک دنیا کی مختلف قوموں نے اس کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور تجارت، صنعت وحرفت حتیٰ کہ زور و جبر کے سہارے ہندوستان میں نقل مکانی کرتے رہے اور جب مختلف قوموں اور تہذیبوں نے اکثریت سے نقل مکانی کی تو یہاں کی قدیم تہذیبوں نے مل کر یہاں کی ایک گنگا جمنی تہذیب کو جنم دیا۔

مختلف تہذیبوں اور زبانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد ان تہذیبوں کے نئے مراکز بھی قائم ہوئے اور انہی بہت سے مراکز میں سے ایک مرکز جون پور بھی رہ چکا ہے جو اپنا ایک شاندار ماضی رکھتا ہے۔

فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء) نے اپنے چچا زاد بھائی محمد تغلق عرف جونا شاہ کے نام سے ۱۳۴۱ء یا ۱۳۴۵ء میں گومتی ندی کے شمالی کنارے پر اس شہر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام جونا پور رکھا جو بعد میں جونپور کے نام سے مشہور ہوا۔

ابراہیم شاہ شرقی اور حسین شاہ شرقی کے دور میں ایسے بڑے کام اور خاص طور سے ایسی عمارتیں، مسجدیں اور قانقاہیں تعمیر ہوئیں جن سے جونپور کی شہرت میں چار چاند لگ گئے اور ساتھ ساتھ علماء صوفیاء اور ذہین طلباء کو حکومت کی طرف سے وظائف جاری ہوئے۔ جن سے وہ فکر معاش سے یکسو ہر کر علم وادب کی خدمت میں لگ گئے اور جب اس کی شہرت دور دور تک پھیلی تو مصر وشام

عراق وایران کے علم دوست جونپور آنے لگے۔حکومت وقت نے بھی ان علماء،صوفیاءاور فنکاروں کا شایان شان استقبال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم وادب کے اس مرکز کی مثال بغداد اور شیراز کے مرکزعلم وادب سے دی جانے لگی اسے شیراز ہند کا خطاب ملا۔ یہاں ہزاروں علماء، ادباءاور فنکار پیدا ہوئے ان میں سے چند عالمگیر شہرت رکھنے والوں کا ذکر کیا جاتا ہے : ملک العلماء قاضی شہاب الدین، سید محمد مہدی جونپوری، شیخ علی متقی، سید عبدالاول جونپوری، ملا محمد یزدی جونپوری، استادالملک ملا محمد فضل، ملا محمود جونپوری، دیوان عبدالرشید، ملا جیون جونپوری وغیرہ۔

ادباءاور شعراء کی ایک لمبی فہرست ہے سب کا ذکر ممکن نہیں صرف ان کے تذکرے پر اکتفاء کرتی ہوں جو آج بھی علم ادب کی شمع روشن کئے ہیں یا علمی وادبی دنیا میں اپنے انمٹ نقوش چوڑ گئے ہیں۔

ہندی شعراء میں نور محمد کامیابؔ صبرحدی، اندراوتی اور انوراگ بانسری اور تل دمن جیسی معرکۃ الآرا کتابوں کے مصنف ہیں۔فغانیؔ (فارسی وہندی) ساماںؔ (فارسی) حیدر بخش (ملا جمیل کے پرپوتے ہیں جو فتاویٰ عالمگیری کے مولفین میں ہے) حفیظ جونپوری (یہ امیر مینائی کے شاگرد تھے) حکیم شفا (جو داغ کے شاگرد تھے) ہاشم جونپوری جو شاعری کے ساتھ ساتھ فن تاریخ گوئی کے بھی ماہر تھے۔

اس کے علاوہ جونپور کے مشہور قصبات منڈیاہوں، مچھلی شہر، کج گاؤں، ظفرآباد، کھیتا سرائے، صبرحد، اور شاہ گنج میں علماء وفضلاء، حفاظ اور قرأ، ادیب وشعراء کی ایک لمبی اور قابل رشک فہرست دیکھی جاسکتی ہے بقول وامقؔ

''بہرکیف جونپور اپنی قدیم روایتی شہرت کو اپنی امرتی، خربوزہ، مولی، چمیلی کے تیل اور عطریات کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہے''

(وامق جونپور گفتنی ناگفتنی)

باب دوم: وامق جون پوری کے سوانحی حالات

آپ کا پیدائشی نام احمد مجتبیٰ زیدی ہے اور وامقؔ تخلص تھا آپ ۲۳/اکتوبر ۱۹۰۹ء کو جونپور کے ایک مشہور قصبے کج گاؤں میں پیدا ہوئے۔

وامقؔ ایک نجیب الطرفین سید تھے آپ کے مورث اعلیٰ سید بڑے میر تھے جن کا سلسلۂ نسب اکیسویں پشت میں حضرت علیؓ خلیفۂ چہارم سے ملتا ہے وامق صاحب ایک اچھے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں پشتوں پہلے سے علم وادب کا چراغ روشن چلا آتا تھا اور ان کے خاندان کے بہت سے لوگ سرکار انگلیشیہ کے اعلیٰ عہدے پر مامور تھے۔

وامقؔ کے دادا مولانا مجتبیٰ صاحب اپنے زمانے کے باکمال عالم تھے اور انھیں عربی، فارسی کے علاوہ سنسکرت پر عبور تھا ساتھ ہی ساتھ علم نجوم پر بھی قدرت حاصل تھی اردو میں علم نجوم پر ایک کتاب بھی 'النجوم' کے نام سے لکھی تھی۔

وامق صاحب کو مطالعے کا بچپن سے شوق تھا وہ اپنے پسند کی کتابیں اور رسائل دوسری جگہوں سے بھی حاصل کر کے اپنا شوق پورا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ مضمون نگاری اور نقشہ نویسی، مصوری وغیرہ کے امتحانات میں اچھے نمبر حاصل کر کے انعام حاصل کیا کرتے تھے۔

باب سوم: اردو میں ترقی پسند تحریک کا پس منظر

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے بعد کانگریس کے (اعتدال پسند طبقہ جس کی رہنمائی گاندھی جی کے ہاتھ میں تھی) نے جنگ میں انگریزوں کا بھرپور ساتھ دینے اور جنگ میں کامیاب ہونے پر انگریز وائسرائے کو مبارکبادی تو ان کو امید تھی کہ انگریز بہادر ہندوستانیوں کی اس بیش بہا خدمات کے سلسلے میں ہندوستانیوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں تبدیلی لائینگے اور ان کی نفرت محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔

انقلاب روس سے متاثر ہو کر ہندوستان میں بھی ۱۹۴۰ء میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی

جا چکی تھی ۔۱۹۴۱ء میں اس نے کانگریس کے احمد آباد کے اجلاس میں ایک اعلانیہ شائع کیا۔

ذہنی کشمکش اور پراگندہ حالات میں لندن میں تعلیم حاصل کرنے گئے چند نوجوانوں کو کچھ کرگزرنے کا خیال آیا جس کے تحت چار پانچ نوجوانوں نے سجاد ظہیر کے کمرے میں جس کی حیثیت اسٹڈی روم کی تھی ایک ادبی انجمن بنانے کی ٹھانی اور کچھ دنوں کے غور وفکر کے بعد ان نوجوانوں نے انجمن کی تشکیل کے لئے ایک دستور تیار کیا اور اس کا باقاعدہ پہلا جلسہ لندن کے نان کنگسار ریسٹوران میں ہوا اور اس کا نام ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن (Indain progresive writers Association) رکھا گیا۔اس کے پہلے صدر ملک راج آنند تھے۔انجمن کا دستور یہ تھا کہ ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں پرانے معتقدات اور خیالات کی جڑیں ہلتی جا رہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔ ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کو تعمیر و ترقی پر لگانے میں مدد و معاون ہوں۔ ہندوستانی ادب قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح و بے اثر ہو گیا ہے اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پسندوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے۔انھیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں اس تحریک کے بانیوں نے طے کیا کہ وہ ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کرینگے ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ان کی موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیئے اور وہ ہے روٹی کا، بدحالی کا اور سماجی پستی کا۔وہ سب کچھ جو ہم میں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے جو ہمیں اپنی عزیز روایات کو بھی عقل و ادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کو اکساتا ہے جو انہیں صحت مند بناتا ہے اور ہم

میں اتحاد و یکجہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اسی کو ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ان مقاصد کو سامنے رکھ کر انجمن نے کچھ تجاویز پاس کیں۔

اس تحریک کی حمایت میں ملک کے مختلف شہروں اور قصبوں میں جلے ہوئے اور ہم خیال شعراء وادباء اس میں شامل ہوتے گئے۔ان میں جوشؔ، فیضؔ، سردار جعفریؔ، مخدومؔ اور وامقؔ کے نام نمایاں ہیں۔عوامی تحریک کے سلسلے میں ان شاعروں نے اہم کردار ادا کیا مگر افسوس کہ جو تحریک بڑے زور شور سے اٹھی تھی وہ جلد مختلف وجوہات کی بنا پر ختم ہوگئی۔

باب چہارم: وامق کی نظمیہ شاعری

ہندوستان جنگ کی تباہیوں سے تڑپ ہی رہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوگیا مگر اس پر مسرت اعلان کے ساتھ ساتھ ملک کی تقسیم جیسے سنگین مسئلے نے آزادی کی ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ملک کی ناعاقبت اندیشانہ تقسیم، پھر بنگال، پنجاب کی تقسیم جس سے لاکھوں انسان خود انسانوں کے ہاتھوں فرقہ پرستی کے شکار ہوئے،لوگوں کے گھر چھوٹے، در چھوٹے، ملک چھوٹا، بھائی بند، عزیز و اقارب چھوٹے اور اس طرح یہ سب انجام پذیر ہوا کہ ہماری پوری انسانیت بلبلا اٹھی ایسے میں ترقی پسند تحریک اور اس کے ہراول دستے کا ایک سپاہی کیسے الگ رہ سکتا تھا۔وامق دوسری جنگ عظمی کے آغاز سے پہلے ہی جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ نظام میں غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور بے بسوں کے خلاف اپنی قلمی جنگ چھیڑ چکے تھے وہ بھلا ان سخت حالات میں کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔

وقت کے بدلتے ہوئے تیور کا وامقؔ نے بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا جس سے ان کی ذہنی وابستگی، غریب، مزدور، عوام، اور محنت کش عوام کے ساتھ بڑھتی چلی گئی اور وامق نظموں پر نظمیں لکھ کر عوام وخواص میں مقبول ہوتے چلے گئے۔وامق کی نظم ''کون ہنسا'' ''مینا بازار'' ''گیت بھینکر'' 'زمین' 'آفرینش' 'وقت' 'آنکھیں وغیرہ مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

وامقؔ کے مزاج کی جرأت مندی، ان کی آواز کی بلندی، ان کے لہجہ کی تیزی، ان کے طبیعت کا تیکھا پن ان کی شاعری کی فضا میں رچا بسا ہے۔ان کی نظموں کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ فن کی راہوں میں نئے امکانات کے متلاشی رہے ہیں وہ مستقل مزاجی کے ساتھ فن کی راہوں میں بڑھتے چلے گئے انھوں نے فن کو عبادت کا درجہ دیا اور اس عبادت میں بڑی ریاضت کی ہے اسی لئے وامقؔ کی بعد کی شاعری میں فن کے گہرے رچاؤ کے ساتھ شعریت رمزیت، کنائیت، صوری و معنوی حسن اور تہہ داریوں کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

باب پنجم: وامق کا نظریۂ شعر

وامق ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں تھے ترقی پسند تحریک پر کی گئی تنقیدوں اور تبصروں پر بہت کچھ لکھا گیا جس کا ذکر وامق نے اپنی نظم ''مداوا'' میں کیا ہے اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ عوامی مسائل جبر و استبداد، جاگیردارانہ نظام، سرمایہ داری، فرقہ پرستی اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف وامق نے بنا کسی مصلحت اور مصالحت کے جس طرح اپنی شاعری میں اظہار کیا ہے جس طرح سامراج سے ٹکر لی، ہر طرح کی قربانیاں دیں قید و بند کی سختیاں جھیلی ں ان میں جرأت، لگن اور اخلاص کی کمی نہ تھی وامق نے ہر محاذ پر ان برائیوں کے خلاف مخلصانہ مورچہ کھول رکھا تھا۔ وامق خود جاگیردارانہ نظام کے پروردہ تھے مگر جس طرح انھوں نے اپنے عیش و عشرت سے بھرپور زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے عمل اپنی زبان، اپنے قلم سے اظہار نفرت کا ثبوت دیا وہ بلا شبہ قابل تحسین ہے۔ وہ ادب برائے زندگی اور جیو اور جینے دو' کے فلسفے پر زندگی بھر عمل پیرا رہے۔ وامق نے خود اپنے نظریۂ فن کی عکاسی اپنی تحریروں میں اس طرح کی ہے۔

> ''ادب کو انسان دوستی کا روشن منارہ ہونا چاہئے قومی یکجہتی، ملکی سالمیت اور آزادیٔ ضمیر کا آئینہ دار ہونا چاہیئے اور حسن محبت کا لالہ زار جو ادیب باطل اور قاتل سے نفرت نہیں کرسکتا (خواہ اس کا مرکز اندرونی ہو یا بیرونی) وہ حسن و عشق

سے نہ محبت کر سکتا ہے نہ آزادیٔ ملک وقوم اس کی نظر میں کوئی حیثیت رکھتی ہے تو
اس کی تخلیقات قابل اعتنا نہیں۔''

مقدمہ شب درد ص ۱۴

اور اپنے اس دعوے کی تائید انھوں نے اپنی نظم فن میں بھی کی ہے۔

سوال جب کبھی اٹھتا ہے مقصد حیات کا
تو حرف ورنگ وسنگ میں جواب بن گیا ہوں میں
جہاں بھی حق کی بات دب گئی ہے شور ظلم میں
اٹھالیا ہے میں نے اپنے سر پہ آسمان کو
جہاں کہیں عوام کا سوال بن گیا ہوں میں
تو جابروں کی جان کا وبال بن گیا ہوں میں
میں فن ہوں میری انگلیاں ہیں زندگی کی نبض پر
قدم مرا زمین پر تو کائنات پر نظر

وامق ترقی پسند تحریک میں دل وجان سے شریک تھے اور بقول علی سردار جعفری

''ترقی پسند تحریک میں شریک ہونے کی ایک شرط ہے جس پر تمام مصنفین متفق
ہیں اور وہ ہے ادب میں عوامی زندگی کی ترجمانی کرنا''

(ترقی پسند ادب-علی سردار جعفری ص ۲۷)

غرض اس طرح وامق اپنے نظریہ فن واعتقاد یعنی انسان دوستی، قومی یکجہتی، ملکی سالمیت اور آزادیٔ ضمیر کے ہمیشہ علم بردار رہے اور اپنے آخری ایام تک ظلم وناانصافی، جبر وفرقہ واریت و سامراجیت کے خلاف سینہ سپر بھی رہے۔

باب ششم: وامق کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

وامق نے ۱۹۴۰ء سے شاعری کی ابتداء کی اور بقول ان کے دو سال تک روایتی شاعری سے متاثر رہے وامق کو اپنے احساسات کی ترجمانی کے لئے وسیع میدان کی ضرورت تھی جسے نظم کا وسیع دامن ہی پورا کر سکتا تھا اور اسی مقصد نے شاعری میں نظم کو اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا اسی لئے دنیائے ادب میں وامق ایک نظم کے شاعر کی حیثیت سے جانا اور مانا جاتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ انھوں نے غزل کی زمین کو ترک کر دیا تھا اوائل کے دو سال (جس میں انھوں نے اپنی روایتی شاعری کا اعتراف کیا ہے) کے علاوہ بھی اچھی خاصی غزلیں کہیں ہیں جو اپنے فنی حسن سے آراستگی کے ساتھ ساتھ جمہوری مزاج سے ہم آہنگ ہیں غزل کے محدود دائرے میں بھی انھوں نے عصر حاضر کے تمام مسائل اور اس کی بے اعتدالیوں؛ پیچیدگیوں اور نفسیاتی کشمکش کو اپنا موضوع بنایا ہے اور مندرجہ بالا برائیوں کے خلاف احتجاج کے 'لئے' ان کی غزل میں بھی سنائی دیتی ہے۔

اپنا اعجاز دکھا دے ساقی — آگ سے آگ بجھا دے ساقی
نقش بیدار مٹا دے ساقی — ہم کو آزاد بنا دے ساقی
وہ جو تسبیح لئے ہیں اس کو — مرے آگے سے اٹھا دے ساقی

وامق حالات سے سمجھوتا کرنے کے قائل نہیں بلکہ آخری سانس تک اس سے نبرد آزما ہو کر اس کا رخ موڑ دینے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے دل کی مضبوطی، بلند حوصلگی، ان کا ایمان و یقین انھیں برابر جدوجہد کے لئے للکارتا ہے وہ ظلمت شب کے بعد نور سحر پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی ایمان و یقین کے سہارے مایوسیوں کے حصار سے نکل کر نغمۂ حیات سنانے لگتے ہیں۔

نالہ کرنا مرا دستور نہیں
آسماں ورنہ بہت دور نہیں
مرے فکر و فن کو نئی فضائے بال و پر کی تلاش ہے

جو قفس کو پاس کے پھونک دے مجھے اس شرر کی تلاش ہے
مرے ناصحا مرے نکتہ چیں تجھے میرے دل کی خبر نہیں
میں حریف مسلک بندگی تجھے سنگ در کی تلاش ہے

وامق نے سماج وادب کے بدلتے ہوئے انداز کا خیر مقدم کیا ہے اور پورے عزم کے ساتھ اپنی پوری تخلیق میں برتا بھی ہے وہ فن اور زندگی کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹتے اسی لئے ان کے کلام میں زندگی اور ادب کی تبدیلیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

وامق نے اپنے شروع کے دو سال کی شاعری کو اپنے شعری مجموعہ ''جرس'' میں اس لئے نہیں شامل کیا کہ بقول ان کے وہ بظاہر بہت حسین مگر بے روح تھے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ انہیں سرے سے نظر انداز کر دیا جائے ان میں بہت سے اشعار کو حاصل غزل کہا جا سکتا ہے۔

جو دور سے آئے دیکھو تو چاند جیسا لگے
قریب جاؤ تو پتھر دکھائی دیتا ہے
دل کے ویرانے کو یوں آباد کر لیتے ہیں ہم
کر بھی کیا سکتے ہیں تجھ کو یاد کر لیتے ہیں ہم

وامق کے مجوعہ کلام ''جرس''''شب چراغ''اور''سفر نا تمام'' میں شامل غزلیں بہت خوبصورت اور جاندار ہیں۔ وامق نے چوتھے مجموعہ کلام سفر نا تمام میں اپنی نظریات اور کلاسیکل اسٹائل کو بروئے کار لانے کی کامیاب کوشش کی ہے بقول ایس۔ ایم عباس

''انھوں نے سفر نا تمام میں زبان، بیان، علامتوں اور ترکیبوں کے استعمال میں ایک اجتہاد سا کیا ہے فنی لوازمات، فکری بصیرت تہ داری، فن اور حسن کے امتزاج ان سب باتوں نے کلام میں دلکشی اور رعنائی پیدا کر دی ہے''۔

(ایس۔ ایم۔ عباس وامق شخص اور شاعر)

سفر نا تمام میں مختصر اور طویل دونوں بحروں میں غزلیں شامل ہیں بلا شبہ وہ اپنا ایک الگ اسٹائل اور الگ رنگ رکھتی ہیں ان میں کچھ غزلیں فنی اور معنوی انداز سے منفرد ہیں نئے اسلوب، استعارے، تشبیہات ومحاوروں نے اسے اور خوبصورت اور مؤثر بنا دیا ہے جو ان کی واقعاتی، جذباتی وابستگی کے ساتھ ان کے عصری آگہی کا ثبوت بھی ہیں۔

شہر میں تنہا گھوم رہے ہو
گھر بھر میں کہرام مچا ہے
آپ اور میرا خانۂ ویراں
کہئے کوئی کام پڑا ہے

.....

سویا کئے ہیں ڈھانپے ہوئے منہ ترے بغیر
جاگا کئے ہیں پاس ترے رات رات ہم

.....

تا سحر کرتے رہے ہم انتظار ماہ نو
دیکھتے ہی دیکھتے ایسی گھٹا چھائی کہ بس
کچھ شعور وحس کا ہے بحران ہم میں ورنہ ہم
عہد نو کی اس طرح کرتے پذیرائی کہ بس

الفاظ کے انتخاب اور اس کا برمحل استعمال کلام میں جان ڈال دیتا ہے اور اس سے بہت سے بے معنی اور مہمل الفاظ بھی خوبصورت اور بامعنی ہو جاتے ہیں بغیر کسی پرواہ کے وامق نے اپنے کلام میں ایسے تجربے خوب کئے ہیں

نہ بھٹکیں ظلمتوں میں شمع دل جلائیں سب
سب اس کو مانیں تو ہم بخش دے خطائیں سب

وامق کو واقعی اپنی متعین کردہ راہ پر چلنے پر فخر بیجا بھی نہیں اس کو انھوں نے بنایا اور برتا بھی ہے وہ شاعری کے نشیب و فراز سے واقف ہیں ۔اپنے ان اشعار میں وہ اپنی بات و جذبات کی ترجمانی اس انداز سے کرتے ہیں کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا زبان و بیان کا لطف اس چھوٹی بحر کی غزل میں دیکھیں

کہہ رہی ہیں زبان حال سے کچھ　　چیختی بے زبانیاں کیا کیا
سطح پر اک جمود سا طاری　　زیر دریا روانیاں کیا کیا
اس کھنڈر کو بنا دو تاج محل　　دفن ہیں یاں جوانیاں کیا کیا
بن گئے سب غلام ابن غلام　　بک گئیں حکمرانیاں کیا کیا
اس قلم کا اڑا دو سر یارو　　لکھ رہا ہے کہانیاں کیا کیا

وامق زبان وقلم کے ذریعہ بسیار گوئی کے قائل نہ تھے وہ بہت کم بولتے اور کم کہتے تھے مگر خوب کہتے تھے ۔حق گوئی و بے باکی ان کا مسلک تھا۔اس کے لئے انہوں نے کبھی مصالحت کی اور نہ مصلحت سے کام لیا۔مزاج میں عزت اور خودداری تھی ۔خوشامد پسندی اور چاپلوسی سے سخت نفرت تھی نہ خود کرتے تھے نہ اپنے لئے پسند کرتے تھے ان کے دو شعر ان کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں ۔

کیا ضروری ہے دیوان پر دیواں لکھوں
ایک شعر ایسا کہو زندۂ جاوید رہو

.....

آہن نہیں کہ چاہئے جب موڑ دیجئے
شیشہ ہوں مڑ تو سکتا نہیں توڑ دیجئے

وامق اپنی تخلیقات کے بارے میں خود فرماتے ہیں۔

''اپنی تخلیقات کی طرف سے مطمئن ہو جانا ناپیدا کنار امکانات کو جھٹلانا ہے۔ تاہم میں بڑی حد تک اپنی تخلیقات کی طرف سے مطمئن ہوں اور اس پر بھروسہ رکھتا ہوں کہ اس میں میں نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک لگا دیا ہے اور اس سے زیادہ میرے بس میں نہ تھا۔''

(وامق جونپوری ایک انٹرویو انقلاب بمبئی جولائی ۱۹۸۴ء)

باب ہفتم: خودنوشت سوانح (گفتی ناگفتنی) کے حوالے سے وامق کی نثر نگاری کا جائزہ

شاعری کی طرح نثر نگاری بھی ایک فن ہے شعر میں جس طرح الفاظ کا برمحل استعمال خوبصورت تشبیہات، استعارے وکنائے و عام فہم زبان جس طرح سننے والے متاثر ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح خوبصورت نثر جو مناسب الفاظ سیدھی سادھی صاف ستھری زبان، اظہار مدعا کا خوبصورت پیرایہ بھی قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی مسجع ومرصع ومقفیٰ تحریروں کے مقابل غالبؔ کے خطوط کی زبان جو تصنع سے پاک سیدھے سادے انداز میں ہے، زیادہ پسند کی گئی اور بعد کے بے شمار ادیبوں نے ان کی پیروی کی جس سے اردو نثر نگاری نے ایک نئی راہ متعین کی۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری کے انداز فکر کو بدلا۔ اس نے اردو نثر کو موضوع ومواد کے علاوہ اس کے ہیئت واسلوب کو بھی نیا رنگ دیا۔ نثر میں بھی کوشش کی گئی کہ اسے عوامی ادب بنایا جائے اور اس کے لئے ضروری تھا کہ عوامی مسائل کے موضوع کے ساتھ زبان بھی عام فہم استعمال کی جائے جس سے عوام متاثر ہوں۔ وامق بھی اسی دور کی پیداوار ہیں جس طرح انہوں نے شاعری کی ایک نئی راہ متعین کی۔ ان کا یہ انداز ان کے نثری کارناموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ وامق کا نظریہ ہے۔

''کہ جتنا اچھا انشاء پرداز ہوگا وہ اتنا ہی اچھا شاعر بھی ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہر انشاء پرداز شاعر ہوسکتا ہے یعنی شاعر کا نثار ہونا ضروری ہے جبکہ نثار کا شاعر ہونا یقینی نہیں''۔

غالبؔ عہد آفریں شاعر

(ریڈیو کشمیر کے لئے) وامق شخص اور شاعر

ایس۔ایم۔عباس ص ۸۴۔۸۵

اور وامق کا یہ بھی فیصلہ ہے۔

''کہ نثری ادب میں خودنوشت سے زیادہ مشکل گوئی اور صنف نہیں ہے''

اسی لئے شاید انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''گفتی ناگفتنی'' لکھی جو اچھی خاصی ضخیم یعنی ۴۳۲ صفحات پر مشتمل ہے جسے بلا شبہ ان کا منفرد کارنامہ کہا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے اپنے خاندانی حالات و ماحول وشجرۂ نسب سے لیکر اپنی بیشہ وارانہ زندگی، جنگ آزادی، جنگ عظیم، تہذیبی سماجی وثقافتی و سیاسی انقلاب، واقعات، حادثات وشخصیات پر کھل کر تبصرہ کیا ہے جس سے ان کے داخلی و خارجی حالات و معاملات خود ان کے مزاج ونفسیات و جذبات کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے اس کے علاوہ ان کی پسند، ناپسند و مذاق، مزاج کا بھی پتہ لگتا ہے۔ اپنی خودنوشت کے دیباچے میں روشنی ڈالی ہے۔

وامق اپنی صاف گوئی، بے باکی اور خود پسندی کی بناء پر کبھی مصلحت پسند نہ رہے جس کی وجہ سے وہ خود تحریک کے اندر اور باہر اپنے حلقۂ احباب میں ہمیشہ اختلاف کا باعث بنے رہے جس کا اعتراف بھی ان کی جرأت مندی کی دلیل ہے۔

وامق کی زندگی کا ایک اہم حصہ علی گڑھ میں گزرا شروع میں یہاں کے شب وروز ادبی فضاؤں میں ان کا جی لگنے لگا لیکن بہت جلد علی گڑھ کی فضاؤں میں ان کا دم گھٹنے لگا یہاں تقریباً چھ برس گزارنے

کے بعد دو سال کی رخصت بلا تنخواہ لے کر ڈپٹی رجسٹرار کے عہدے پر ریجنل کالج سری نگر کشمیر چلے گئے اپنے علی گڑھ چھوڑنے کی وجہ وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

''علی گڑھ میں چند نام ونہاد شاعروں اور ادیبوں کا ایک ایسا گروہ بھی تھا جس کو وہاں میرا وجود ایک آنکھ نہ بھاتا تھا یہ وہ حضرات تھے جو کبھی اپنے نام ونمود کے لئے انجمن ترقی پسند مصنفین کے بڑے سرگرم کارکن تھے جس کا شیرازہ بکھر چکا تھا اب اس کو مردہ سمجھ کر اس پر وار.....اور میں ان بزرگوں میں تھا جو انجمن کے احیاء کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے مگر ارباب تحریک میں وہ نفسانفسی اور انتشار پھیلا ہوا تھا کی میری صدا وصدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی۔

(گفتی وناگفتنی)

وامق صاحب کی خودنوشت سوانح کے بارے میں ڈاکٹر جعفر عسکری کا یہ تبصرہ انتہائی مناسب اور اس سے وامق کی ذہنی کرب وانتشار کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو

''گفتنی ناگفتنی کو موٹے طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا حصہ طربیہ، نشاطیہ اور شگفتہ کہا جا سکتا ہے جس سے مذکورہ سرگزشت حیات میں ایک فرحت بخش فضا کیف آور سرخوشی، تروتازگی، اور انبساط کی زیریں لہریں موجزن نظر آتی ہیں خاندانی حالات بیان کرتے ہوئے اپنے وطن کج گاؤں (جونپور) کی علمی وادبی اہمیت کا بکھان کرتے ہوئے طالب علمانہ وپیشہ وارانہ زندگی کے حوالے سے بعض دلچسپ واقعات، دیرینہ احباب اور پسندیدہ مقامات وشخصیات کے تذکرے میں ادبی زندگی کے آغاز مشاعروں میں شرکت کے احوال بیان کرتے ہوئے وامق وفور جذبات سے مغلوب نظر آتے ہیں۔اس حصے میں شگفتہ بیانی، دل کش اسلوب نگارش، جدت فکر اور رفعت تخیل کے کامیاب نمونے نظر آتے ہیں

کتاب کے اس حصے کو افسانوی فضا اور مصورانہ رنگ آمیزی سے اسے دلکشی عطا کی''۔

(ڈاکٹر جعفر عسکری-وامق جونپور گفتنی ناگفتنی کے آئینے میں جون نیا دور ۱۹۹۹ء)

وامق نے اپنی سوانح یا سرگزشت میں اسلوب، صنعت گری، دلکشی، جرأت مندی و بے باکی کا جس طرح مرقع پیش کیا ہے بلا شبہ اسے اردو کے نثری ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے اسے ادب کے ایک ذریں دور کے عروج وزوال کی دلکش اور مستند تاریخی دستاویز کہنا غلط نہ ہوگا۔

باب ہشتم: اردو ادب میں وامق کا مقام

وامق جونپوری نے ایک لمبی عمر پائی (۱۹۰۹ء سے ۱۹۹۸ء) جس میں ان کی ادبی کاوشوں کی عمر بھی کافی لمبی ہے یعنی وہ قریب ۱۹۴۰ء سے آخری وقت تک یعنی ۱۹۹۸ء تک اردو ادب کی خدمت کرتے رہے یعنی تقریباً اٹھاون سال۔ اتنی لمبی مدت میں اگر ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً وہ بہت کم نظر آتا ہے اس کی کچھ وجوہات ہیں اول تو خوب سے خوب تر کی عادت نے ان کے قلم کو روکا دوسرے ان کی طنک مزاجی وخودداری نے انہیں ہر ادبی مجالس سے روکا دوسرے ان کے مختلف شوق جیسے شکار، باغبانی، مگس رانی نے ان کا دامن کھینچا اور تیسرے ریٹائر ہونے کے بعد قریب تیس سال سے اپنے گاؤں میں عوامی مسائل اور دلچسپی کے باعث وابستگی نے انہیں بسیار گوئی سے روکا ویسے بھی وہ مزاجاً بسیار گوئی کے قائل نہ تھے ان کا عقیدہ تھا کی بامقصد ایک شعر کے بدلے بے مقصد شاعری کا ایک دیوان دیا جاسکتا ہے انہی سب اسباب کی بناء پر بلا شبہ ان کا ادبی ذخیرہ کم تو کہا جاسکتا ہے مگر بے وجہ نہیں اگر وہ مشاعروں کے رسیا اور ادیبوں کے گروپ بندی کے شکار ہوتے تو بلا شبہ آج ان کی تخلیقات کا گراف اور اونچا ہوتا۔

وامقؔ اور ان کے چاہنے والوں کو یہ احساس ہے کہ ادب میں ان کو وہ مرتبہ و مقام نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے لیکن وہ اس بات سے خوش اور مطمئن تھے کہ انہوں نے اپنے ضمیر کو کسی

آلودگی میں ملوث نہیں ہونے دیا اور نہ کبھی اپنے فن کا سودا کیا ڈاکٹر سید فضل امامؔ نے اپنے ایک تبصرے میں بجا طور پر فرمایا تھا۔

''حضرت وامقؔ جونپوری بجا طور پر ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے واقعتاً خون دل سے شعر وادب کی آبیاری کی ہے وہ نام ونمود سے بلند ہوکر گیسوئے شعر وسخن کی مشاطگی میں انتہائی خشوع وخضوع سے منہمک رہے وہ دنیوی حرص وطمع سے بے نیاز رہے اور یہی بے نیازی ان کی منفرد شان عظمت کا نشان ہے۔اس میں کسی کو کلام نہیں کی وامق ایک عوامی شاعر وادیب تھے اور جہاں بھی رہے ہمیشہ عوامی مسائل ان کے سامنے رہے اس کے حل کے لئے ہمیشہ زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر کوشاں رہے یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی بھر اپنے سامعین اور اپنے عوام سے قریب تر رہے بلکہ آج بھی ان کے وطن کج گاؤں اور اور مضافات کے لوگ پیار سے صرف صاحب کے نام سے پکارتے ہیں اور وامقؔ کو یاد کر کے اپنی آنکھوں کو پرنم کر لیتے ہیں''۔

وامقؔ نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے یوں تو وہ نظم کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور ہیں مگر انہوں نے نظم اور غزل کے علاوہ رباعیاں، مرثیے، لوک گیت، کجری اور بجرے تک میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں اسی طرح نثر میں جہاں انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''گفتنی ناگفتنی'' کے نام سے لکھی وہیں مختلف موضوع پر مضامین بھی لکھے جو جنرل جیسے پرچوں میں شائع ہوئے اور کشمیر ریڈیوں سے نشر بھی ہوئے۔انھوں نے مختلف مقالات، تبصرے، تنقیدیں اور دیباچے بھی لکھے جو منتشر ہیں اگر ان کو اکٹھا کر کے کتابی شکل دی جائے تو ان کی تخلیقات میں بے بہا اضافہ ہوسکتا ہے۔

WAMIQ JAUNPURI

LIFE AND LITERARY WORKS

ABSTRACT

Thesis Submitted for the award of the degree of

Doctor of Philosophy

IN

URDU

By

NISHAT AFROZ

THESIS
T-5963

UNDER THE SUPERVISION OF

Dr. QAISAR JAHAN
PROFESSOR & CHAIRPERSON

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

Dec. 2002

وامق جون پوری - حیات اور ادبی کارنامے

مقالہ برائے پی ایچ - ڈی.

نگراں

ڈاکٹر قیصر جہاں

پروفیسر وصدر شعبۂ اردو

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

مقالہ نگار

نشاط افروز

شعبۂ اردو

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ، یوپی، انڈیا

دسمبر ۲۰۰۲ء

T - 5963

T5963

DEPARTMENT OF URDU

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH-202002 (India)

Tel { 700920,921
{ Extn 336

Prof. Qaiser Jahan
Chairman & Coordinator,DSA

Dated: 28.12.2002

Certified that this thesis entitled "WAMIQ JAUNPURI HAYAT AUR ADABI KARNAME" by Ms.Nishat Afroz is an original Research work and has not been submitted for any other degree to this or any other University and is capable of being submitted for the award of the degree of Doctor of Philosophy in Urdu.

(Prof. Qaiser Jahan)
Supervisor

Counter signature

(Prof. Qaiser Jahan)
Chairman

فہرست ابواب

باب اول	جون پور کا ادبی پس منظر	۱۰-۲۱
باب دوم	وامق جونپوری کے سوانحی حالات	۲۲-۵۰
باب سوم	اردو میں ترقی پسند تحریک کا پس منظر	۵۱-۷۰
باب چہارم	وامق کی نظمیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ	۷۱-۱۱۹
باب پنجم	وامق جونپوری کا نظریۂ شعر	۱۲۰-۱۵۰
باب ششم	وامق کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ	۱۵۱-۱۷۰
باب ہفتم	خودنوشت سوانح (گفتنی ناگفتنی) کے حوالے سے وامق کی نثر نگاری کا جائزہ	۱۷۱-۱۸۸
باب ہشتم	اردو ادب میں وامق کا مقام	۱۸۹-۲۰۰

پیش لفظ

سید احمد مجتبیٰ زیدی وامق جونپوری ۲۳/اکتوبر ۱۹۰۹ء میں کج گاؤں ضلع جونپور میں پیدا ہوئے وہ ایک علمی، متمول اور زمیندار گھرانے کے فرزند تھے دادا کا نام مجتبیٰ حسین تھا جو عربی فارسی اور سنسکرت کے عالم ہونے کے علاوہ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔ وامقؔ کے والد محترم سید مصطفیٰ حسین کلکٹر کے عہدے سے پنشن لے کر سبکدوش ہوئے تھے لہٰذا والد محترم کی ملازمت کے دوران جا بجا تبادلہ ہونے کے سبب وامقؔ کی تعلیم مختلف مقامات پر ہوئی جن میں فیض آباد، بارہ بنکی اور لکھنؤ قابل ذکر ہیں وامق کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی تھی ہائی اسکول فیض آباد انٹرمیڈیٹ بارہ بنکی اور بی۔اے، ایل۔ایل۔بی لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا تھا اس کے بعد انھوں نے فیض آباد میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا لیکن شاعرانہ مزاج اور لا اُبالی طبیعت نے وکالت سے دلچسپی پیدا نہ ہونے دی لہٰذا کچھ سالوں تک وکالت کرنے کے بعد انھوں نے اس پیشہ کو ترک کر دیا اور سرکاری ملازمت اختیار کر لی انھوں نے علی گڈھ اور کشمیر کی یونیورسٹیوں میں رجسٹرار کی حیثیت سے بھی کام کیا اور ۱۹۶۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن کج گاؤن جونپور واپس لوٹ آئے۔

وامقؔ نے اپنی شاعری کا آغاز رومانی اور انقلابی غزلوں سے کیا اور یہی رومانی جذبے ان کی سیاسی، سماجی اور انقلابی نظموں میں ایک زور اور جوش پیدا کرتا ہے، یوں تو وامقؔ کی شاعری کا باقاعدہ آغاز فیض آباد یعنی وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے بعد سے ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے بھی وہ اپنے آبائی وطن کج گاؤں کی شعری محفلوں و مجلسوں میں برابر شریک ہوا کرتے تھے اور شعر سنایا کرتے تھے لیکن ان کی شاعری کا باضابطہ آغاز فیض آباد سے ہی ہوا جہاں ان کے دوست حکیم مجے صاحب

کے مکان پر اکثر و بیشتر شعر و شاعری کی محفلیں آراستہ ہوا کرتیں تھیں یہیں انھوں نے اپنے دوست مجے صاحب کے اصرار پر پہلی مرتبہ غزل سنائی جس کو لوگوں نے کافی پسند کیا۔ چنانچہ یہیں سے وہ باقاعدہ طور پر شاعری کی طرف مائل ہوئے۔

وامقؔ کے کلام کے چار مجموعے چیخیں (۱۹۴۸ء) جرس (۱۹۵۰ء) شب چراغ (۱۹۶۸ء) اور سفر ناتمام (۱۹۹۰ء) کے ناموں سے شائع ہوئے ہیں جن پر مختلف اداروں نے انھیں انعامات سے نوازا ۱۹۸۰ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملا اور ۱۹۸۶ء میں ان کی مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں اتر پردیس اردو اکادمی کا انھیں امتیازی انعام اور امتیازِ میر ایوارڈ سے نوازا گیا ۱۹۹۸ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی طرف سے غالب ایوارڈ کا اعلان کیا گیا لیکن اس سے قبل کہ وہ اسے حاصل کرتے موت نے ۲۱ رنومبر ۱۹۹۸ء کی شام سات بجے ہی انھیں ابدی نیند سلا دیا۔

چونکہ وامقؔ جونپوری ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں ان پر گھریلو اور خاندانی پابندی تھی کہ وہ عام لڑکوں یا معاشی لحاظ سے کمزور طبقے کے طالب علموں کو اپنے سے دور رکھیں لیکن انھوں نے کبھی بھی اس پابندی کا لحاظ نہیں کیا بلکہ انہی لڑکوں سے ملنا جلنا اور ان کے ساتھ کھیلنا پسند کرتے تھے انھیں غریبوں اور کسانوں سے ہمدردی تھی ان کی قربت سے نفرت کے بجائے دلچسپی اس لیے تھی کہ انسانیت کی تذلیل اور بے حرمتی، بھوک سے نڈھال جسموں کی پامالی، بے زمین مزدوروں کے غم زدہ چہرے ان کے دل میں اضطراب پیدا کرتے تھے لہٰذا انھوں نے جاگیردارانہ نظام کی مخالفت اور غریب طبقے کی حمایت کی ان کے کلام کے مجموں کے نام سے ہی ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وامق مظلوموں اور محنت کشوں اور مزدوروں کے کرب و درد کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں انھوں نے ہمیشہ سرمایہ دارانہ نظام سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا یہی پہلو ان کی شخصیت اور شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں ہے اسی نے انھیں غریبوں اور مزدوروں کا شاعر بنایا اور وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے پر مجبور ہوئے اس وقت ان کی عمر تقریباً بیس برس تھی۔

وامق جونپوری کا شمار ترقی پسند تحریک کے شعراء اور ادباء میں ہوتا ہے وامق گاندھی جی کے خیالات ونظریات سے کافی متاثر تھے جلیاں والا باغ کا حادثہ، سیاسی رہنماؤں کی قید و بند اور عوامی زندگی پر ڈھائے گئے ظلم وستم دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر غریبوں اور مزدوروں کے مشکلات میں اضافہ، بڑھتی ہوئی غریبی اور بے روزگاری وغیرہ کو انھوں نے اپنی شاعری میں پر اثر اور مؤثر انداز میں پیش کیا۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی اور لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ہونے کے بعد ملک کے شعراء اور ادباء کی توجہ جوش وخروش کے ساتھ جدو جہد آزادی کی طرف ہوئی۔ وامق ترقی پسند تحریک کے بنیادی ستونوں میں سے ایک تھے انھوں نے ساری عمر اس تحریک سے وابستہ رہ کر شعر وادب کے ذریئے عوام کی خدمت انجام دی۔ ان کے پرکشش اور پرتاثیر کلام نے انہیں صف اول کے شاعروں میں شامل کر دیا۔

بقول احتشام حسین

''جن شاعروں نے بہت تھوڑے وقت میں نام پیدا کیا ہے ان مین وامق جونپوری بھی ہیں انھوں نے سنجیدگی سے دوسری جنگ عظیم کے درمیان میں شاعری شروع کی۔ اس لئے ان پر عصری شعور کا اثر نمایاں طور سے دیکھا جا سکتا ہے انھوں نے زیادہ تر سیاسی اور ترقی پسندانہ نظمیں لکھیں ہیں''۔ [۱]

تقسیم ہند کے بعد ہند و پاک میں رونما ہونے والے فسادات نے انسانیت کا سر شرم سے جھکا دیا تھا۔ اس وقت کوئی بھی فنکار اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور ہر ایک نے اپنے اپنے تئیں نفرت اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے خلاف آواز بلند کی اور انسانیت نواز نعرے بلند کیئے وامق بھی ان فسادات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لہٰذا انھوں نے بہت ہی پر جوش اور باغیانہ انداز میں

---

[۱] اردو ادب کی تنقیدی تاریخ - سید احتشام حسین ص ۲۸۸

انھیں اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔

وامقؔ کی دو نظمیں بھوکا بنگال اور مینا بازار نے عوام کو بہت متاثر کیا یہ نظمیں کافی مشہور و مقبول ہوئیں جس سے وامق کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی ان نظموں میں وامق نے سرمایہ دارانہ نظام اور اس طبقے کی دولت جمع کرنے کی ہوس، بے بس انسانوں کی مظلومیت اور انگریزی اقتدار کی بے حسی اور بدنظمی غرض ان تمام کیفیات کو نہایت موثر اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جو انسانیت نواز لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔

ہندوستانی سماج کی چپقلش اور نظام حکومت اور ان سے وابستہ حوادث کی کیفیات کے بیان کے ساتھ ساتھ وامقؔ نے بین الاقوامی مسائل بالخصوص بنی نوع انسان کے تحفظ و بقا کو بھی اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے اس سلسلے میں ان کی نظمیں مائٹی ایٹم، نیلا پرچم، ایک دو تین، کالعدم، کن فکاں وغیرہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ ایٹمی جنگ کے نتائج کتنے بھیانک اور سنگین ہو سکتے ہیں اور اس کے استعمال کے نتیجے میں ساری انسانیت کا وجود نیست و نابود ہو سکتا ہے وامق نے انسانیت کے تحفظ اور قومی یکجہتی کی خاطر فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والوں کے خلاف اپنی نظموں کے ذریعہ نہایت ہی موثر اور خوبصورت انداز میں علم بغاوت بلند کیا۔

وامق کی شاعری عام انسانی مسائل اور سماجی ناہمواریوں کے خلاف ایک پر اثر اور دردمند احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ احتجاج بھی ایک جوشیلے نوجوان کا احتجاج ہے جس کے سامنے صرف ایک مقصد ہے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکیں اس لیے وہ اسی لب و لہجے اور اسی زبان میں بات کرتے ہیں ان کے موضوعاتِ شاعری پر آج کسی کو اعتراض یا اس سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن انھوں نے اپنی شاعری کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کی اثر انگیزی سے کسی کو انکار ہو یہ مشکل ہے۔ اس میں جوش بھی ہے اور اثر آفرینی بھی، وہ اپنی نظموں میں جس نوع کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور جو آہنگ پیدا کرتے ہیں وہ کچھ ہی لمحوں کے لیے ہی سہی ہر شخص کو

متاثر ضرور کرتا ہے وامق کا احتجاج وقت کے تقاضے کا احتجاج ہے ایک مقصد کے لیے احتجاج ہے اگر وہ وقت کے تقاضے اور اس مقصد کو اپنی شاعری میں پورا کرتا ہے تو وہ ایک کامیاب شاعر ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ یہ سوچ کر نہیں لکھا کہ وہ صرف فن کی تخلیق کر رہے ہیں ان کے سامنے وہ حالات تھے جس پر ان کا قلم چیخ پڑتا تھا۔ وامق اردو شاعری کے اسی اجتماعی عہد کا ایک حصہ ہیں جس میں ان کے ساتھ اردو کے کئی اہم نام شامل ہیں جیسے فیضؔ، مجازؔ، مخدومؔ، سرورؔ، ساحرؔ، کیفیؔ، مطلبیؔ، وقارؔ، سلامؔ، وغیرہ۔

وامق نے اپنی شاعری کے ذریعہ لوگوں کو صرف جھنجھوڑا اور جگایا ہی نہیں بلکہ انھیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلایا۔

وامق نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی اپنے خیالات ونظریات کا اظہار کیا ہے وامقؔ کی خودنوشت سوانح حیات گفتنی ناگفتنی ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے اپنی زندگی کی دھوپ چاؤں کی عکاسی کی ہے یہ خودنوشت سوانح نگاری کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان کی جنگ آزادی، دوسری عالمی جنگ، ساسی، سماجی، علمی اور ادبی صورت حال ملک کا تہذیبی پس منظر متعدد مقامات اور شخصیات وغیرہ کے ذکر پر مشتمل ہے جس میں مصنف کی نہ صرف خارجی زندگی بلکہ نفسیاتی کیفیت جبلی خصائل اور موروثی خصوصیات بھی اجاگر ہوتے ہیں۔

مجموعی طور پر ان کی شاعری زیادہ تر سیاسی اور ترقی پسندانہ نظریات کے نوعیت کی ہے جن پر عصری شعور کا اثر نمایاں ہے وامق ایک ایسے ترقی پسند شاعر تھے جنھوں نے ترقی پسندی کے ہنگامی دور میں بے پناہ عوامی مقبولیت حاصل کی تھی لیکن اعتدال کی کمی نے اس ہنگامی دور کے اختتام کے بعد ان کی مقبولیت کو متاثر کیا۔

میں نے وامق جونپوری کو اپنی تحقیق کا موضوع اس لیے منتخب کیا ہے کہ اس شاعر کا صحیح مرتبہ ومقام متعین کیا جاسکے اور اس کوتاہی کا ازالہ ہوسکے جو وامق جونپوری کے ہم عصر ادیبوں نے ان کے ساتھ روا رکھی ہے۔

اس مقالے کی تکمیل وترتیب میں جن مخلص حضرات نے میری کسی طرح کی مدد کی ہے اپنی دل کی گہرائیوں سے ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتی ہوں اس ضمن میں سب سے پہلے اپنی مخلص اور مشفق نگراں اور صدر شعبۂ اردو علی گڈھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر قیصر جہاں کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی بے انتہا مصروفیات کے باوجود قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں یہاں اپنے والد محترم جناب شرف الدین جمالی صاحب ساکن محلّہ اجمیری جون پور کا ذکر نہ کروں جنھوں نے وامق جونپوری کے سلسلے میں ضروری مواد کی فراہمی میں میری مدد کی اور اس مقالہ کو لکھنے کے دوارن بے حد ضروری اور نہایت مفید مشوروں سے نوازا۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت منداور عمر دراز عطا فرمائے۔ یہی خدائے بزرگ و برتر سے میری دعا ہے۔ اس کرم بے پایاں کے لئے شکریہ ادا کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

یہ مقالہ مندرجہ ذیل ابوب پر مشتمل ہے

پہلا باب	:	جون پور کا ادبی پس منظر
دوسرا باب	:	سوانحی حالات
تیسرا باب	:	اردو میں ترقی پسند تحریک کا پس منظر
چوتھا باب	:	وامق جونپوری کی نظمیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ
پانچواں باب	:	وامق جونپوری کا نظریہ شعر
چھٹا باب	:	وامق کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ
ساتواں باب	:	خودنوشت سوانح (گفتنی ناگفتنی) کے حوالے سے نثر نگاری کا جائزہ
آٹھواں باب	:	اردو ادب میں وامق کا مقام

نشاط افروز
نشاط افروز
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو
علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

واثق جون پوری

شجرہ وامق جون پوری

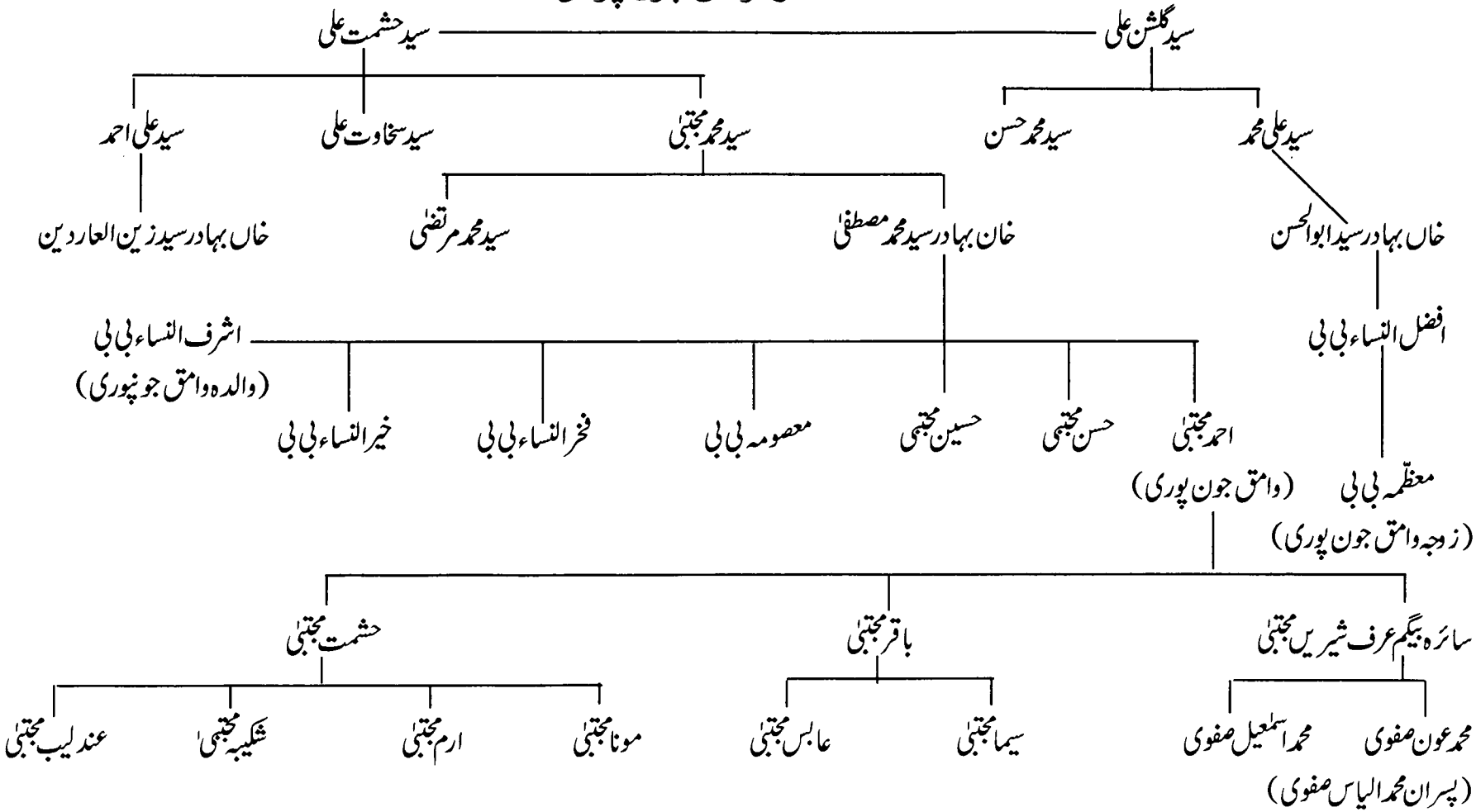

باب اول

جون پور کا ادبی پس منظر

جون پور کا ادبی پس منظر

ابتدائے زمانہ سے آج تک اس دنیا میں نہ جانے کتنی تہذیبوں نے جنم لیا اور اپنا ایک شاندار ماضی چھوڑ کر تاریخ کے صفحات میں گم ہوگئیں۔ اور نہ جانے کتنی قوموں کے عروج و زوال کو تاریخ بھی اپنے صفحات میں نہ سموسکی کیونکہ اس وقت خود فنِ تاریخ کا وجود بھی نہ تھا۔

تاریخ میں قدیم تہذیبوں میں، یونان، مصر اور روما وغیرہ کی تہذیبوں کا چرچا ملتا ہے۔ ہندوستان کتنا قدیم اور اس کی تہذیب کتنی عظیم ہے۔ اس کی شہادت موہن جودڑو اور ہڑپا کے کھنڈرات، اجنتا ایلورا کے باقیات، وادیٔ سندھ اور اشوک کے دور کے تہذیبی آثار و نشانات بانگ دہل کہہ رہے ہیں دلکشی و دلفریبی اور ہر طرح کی فارغ البالی کے لحاظ سے ہندوستان دنیا کا واحد ملک رہا ہے جس کی کوئی مثال تلاش بسیار کے بعد بھی نہیں ملتی اور یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم سے آج تک دنیا کی مختلف قوموں نے اس کی طرف للچائی نگاہوں سے دیکھا اور تجارت، صنعت و حرفت حتیٰ کہ زور و جبر کے سہارے ہندوستان میں نقل مکان کرتے رہے۔ آریوں اور مسلمان حملہ آوروں نے تو اسے اپنا وطن بنایا جب مختلف قوموں اور تہذیبوں نے اکثریت سے نقل مکانی کی اور یہاں کی قدیم تہذیبوں نے مل کر ایک کنگا جمنی تہذیب کو جنم دیا۔ اور ان کے نئے نئے مراکز قائم ہونے لگے اور اس طرح ہندوستان مختلف مذاہب، تہذیب اور زبان کا ایک ایسا سنگم بن گیا جو آج ہر ہندوستانی کے لئے فخر کا باعث ہے۔

جیسا کہ اوپر مذکورہ ہو چکا ہے کہ مختلف تہذیبوں اور زبانوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد ان تہذیبوں کے نئے نئے مراکز بھی قائم ہوئے اور انھیں بہت سے مراکز میں سے ایک مرکز جونپور بھی رہ چکا ہے جو اپنا ایک ایسا شاندار ماضی رکھتا ہے جس کا مٹانا گردش لیل و نہار کے بس کی بات نہیں۔

فیروز شاہ تغلق ۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸ء نے اپنے چچا زاد بھائی محمد تغلق عرف جونا شاہ کے نام سے

۱۳۶۱-۱۳۶۵ء میں گومتی ندی کے شمالی کنارے پر ایک اونچی زمین لائق آبادی دیکھ کر اس کی بنیاد رکھی اور اس کا نام جوناپور رکھا جو بعد میں جونپور کے نام سے مشہور ہوا۔ [۱]

یہ جگہ دہلی اور بنگال کے قریب قریب بیچوں بیچ ہے اس لئے سلطان نے بنگالی اور دیگر ریاستوں پر نظر رکھنے کے لئے سب سے پہلے گومتی کے کنارے قلعہ تعمیر کرایا اور پھر دیگر بستیوں کی بنیاد ڈالی۔

شرقی سلطنت ۱۳۸۸ء میں فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد سلطنت زوال پذیر ہونے لگی اور اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر بہت سے صوبیداروں اور جاگیرداروں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ خود مختاری کا اعلان کرنے والوں میں حاکم اول جونپور کا بھانجہ شہزادہ علاء الدین بھی تھا مگر تھوڑے ہی دنوں بعد علاء الدین کی وفات کے بعد جونپور ہندو جاگیرداروں کے قبضے میں آ گیا جس کی سرکوبی کے لئے سلطان محمود شاہ تغلق نے ملک سرور خواجہ جہاں کو ملک شرق کا خطاب دے کر مئی ۱۳۹۴ء کو جونپور کا گورنر بنا کر بھیجا اور اس نے آتے ہی اپنے حسن انتظام سے جونپور کو ہر طرح مستحکم کیا مگر دہلی پر تیمور لنگ کے حملے کے بعد ۱۳۸۸ء میں اس نے جونپور کو دارالسرور کا نام دے کر اور اپنے نام کا سکہ وخطبہ جاری کر کے خودمختار ہونے کا اعلان کر دیا اور اس طرح شرقی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ شرقی سلطانوں میں ابراہیم شاہ شرقی ۱۴۰۱ء ۱۴۴۰ء اور حسن شاہ شرقی ۱۴۵۸ء سلاطین گزرے ہیں جنھوں نے جونپور کو ہر طرح سنوارنے سجانے کے لئے نہ مٹنے والے نشان چھوڑ گئے ہیں۔ ان کے دور میں جہاں ایک طرف نئی نئی عمارتیں، محلات، مساجد، خانقاہیں اور سڑکیں تعمیر ہوئیں وہیں تمام علماؤ صوفیا، طلبا کو حکومت کی طرف سے وظائف جاری ہوئے جس سے وہ فکر معاش سے یکسو ہو کر علم وادب کی خدمت میں لگ گئے اور جب اس کی شہرت دور دور تک پھیلی تو مصر، شام، عراق وایران کے علم دوست جونپور آنے لگے حکومتِ وقت نے بھی ان علماء وصوفیا وفنکاروں کا شایان شان استقبال کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم وادب کے اس مرکز

---

[۱] شرقی راج اور جونپور کی تاریخ سید اقبال ص ۱۰۳

کی مثال بغداد اور شیراز کے مراکزِ علم ادب میں دی جانے لگی اور اسی دور میں اسے شیراز ہند کا خطاب ملا جو آج علمی حلقوں میں جانا و پہچانا جاتا ہے شرقی سلطانوں نے جہاں ایک طرف اپنی تہذیبی اور مذہبی ثقافت کو پروان چڑھایا وہیں ہندوستانی زبان وثقافت کو پروان چڑھانے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں یہاں پر ہر زبان کے علماء، حفاظ قرآن، ادیب و شاعر، صوفیا، علما اور فنکار پیدا ہوئے ان ہزاروں عالمگیر شہرت رکھنے والوں میں چند علماء، صوفیاء اور شعراء کا ذکر درج ذیل ہے۔

(۱) ملک العلماء قاضی شہاب الدین:

آپ کا آبائی وطن غزنی تھا حصول علم و معاش کی غرض سے آپ کے آباء دلی آ گئے اس زمانے کے مشہور اساتذہ حضرت علامہ قاضی المقتدر اور حضرت علامہ خواجگی آپ کے استادوں میں تھے حضرت مولانا خواجگی کی شہرت سن کر ابراہیم شاہ شرقی نے آپ کو جونپور آنے کی دعوت دی جسے آپ نے قبول فرمایا ابراہیم شاہ نے آپ کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر مامور کر کے عزت بخشی اور تمام عمر اپنے علم و عمل و پاکیزگی کردار سے اہل جونپور کو فیض پہنچاتے رہے۔ آج بھی آپ کے نام سے ایک محلّہ جسے خواجگی ٹولہ کہتے ہیں منسوب ہے۔ آپ کا شمار اس دور کے متقیوں اور پرہیزگاروں میں ہوتا تھا۔ آپ اہل قلم بھی تھے آپ نے مختلف علوم وفنون پر کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔

(۱) بحرِ مواج (قرآن شریف کی جامع تفسیر)

(۲) شرح کافی (جو شرح ہندی کے نام سے موسوم ہے)

(۳) بدیع البیان (فن فصاحت و بلاغت پر بہترین کتاب ہے)

(۴) ارشادیہ (فن نحو سے متعلق)

علامہ خواجگی یعنی اپنے استاد کے ساتھ آپ بھی جونپور تشریف لائے۔ [۱]

---

[۱] تجلی نور ص ۳۴

(۲) سید محمد مہدی جونپوری ۸۴۷ھ ۹۱۰ھ:

آپ ۸۴۷ھ میں جونپور میں پیدا ہوئے۔آپ سید عبداللہ کے فرزند ارجمند تھے بچپن میں دانیال جعفری جیسے بزرگ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی حفظ قرآن کے ساتھ تمام علوم مروجہ پر جلد ہی عبور حاصل کیا۔آپ نے چالیس سال کی عمر میں حج بیت اللہ کیا اور خود کو مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔آپ میں ایک کشش تھی کہ جو بھی ملتا آپ کی گفتار و اطوار سے متاثر ہو جاتا۔اسی بنا پر آپ کی متنازعہ مہدوی تحریک سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے جس میں وقت کے بہت سے حکمراں و امراء و علماء شامل ہوئے جس میں عالم جونپوری اور ہندی کے مشہور شاعر ملک غلام محمد جائسی شامل ہیں۔جنھوں نے اپنی تینوں تصانیف (پدماوت، اکھراوٹ اور آخری کلام) میں آپ کا ذکر کیا ہے آپ تمام عمر اصلاح و تبلیغ اور اپنی متنازعہ تحریک کے سلسلے میں ملک، ملک کے دورے کرتے رہے اور اسی سلسلے میں افغانستان میں ۹۱۵ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا اس کے بعد آپ کی مہدوی تحریک سمٹتی گئی آپ کی اس تحریک کا ذکر ابوالفضل، ابوقسام فرشتہ سے لے کر ابوالحسن علی میاں ندوی تک ہر دور کے علماء اور دانشوروں نے کیا ہے۔

(۳) شیخ علی متقی فخر الہندی:

آپ جونپور میں پیدا ہوئے تاریخ پیدائش کسی تذکرہ نگار نے نہیں لکھی آپ کا پورا نام علاء الدین علی متقی تھا مگر بعد میں صرف شیخ علی متقی کے نام سے مشہور ہوئے آپ کی شہرت کا سبب آپ کی تصنیف ''کنز العمال'' جو سولہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جس کا آخری ایڈیشن سعودی عربیہ سے چھپا ہے۔ فقہ اور فن حدیث پر یہ کتاب ایک نادر نمونہ ہے۔

(۴) سید عبدالاول جونپوری:

آپ کی پیدائش جونپور میں سید علاء الدین لاہوری کے یہاں ہوئی۔آپ نے تعلیم و تربیت کے لئے اس دور کے بہترین علما و فضلا کی خدمت حاصل کی۔پھر آپ نے حصول علم کے لئے دکن گجرات عرب کا سفر کیا جہاں سے جی بھر کر علوم ظاہریہ و باطنیہ حاصل کیا۔آپ نے پھر بخاری شریف کی وہ شرح

لکھی جس پر بجا طور ناز کیا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ ہندوستان کے پہلے عالم دین ہیں جنہوں شرح بخاری لکھی اس کے علاوہ آپ کی کئی تصانیف ہیں۔ آپ کی مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) فیض الباری شرح بخاری شریف

(۲) تعلیقات علیٰ الفتوحات المکیہ

(۳) وعلیٰ المطول

(۴) رسالہ المنظومتہ المواریث

(۵) رسالہ فی تحقیق النفس

(۶) تلخیص سفر اسعادتہ

(۷) شرح بسینا علیٰ تلک المواریث المنظومہ [۱]

بالاخر علم وانوار کا یہ آفتاب ۹۶۸ھ میں غروب ہوگیا۔

(۵) ملا محمد یزدی:

ملا یزدی جونپوری مغل دور اکبری میں جونپور میں قاضی القضا کے عہدے پر فائز تھے اور جب اکبر نے تحریک دین الٰہی چلائی تو جلال اکبری کے سامنے ایک سناٹا چھا گیا اور اکبر کے خلاف جن جن علماؤں نے آواز اٹھائی ان مین سب سے پہلا نام ملا محمد یزدی کا آتا ہے۔ آپ نے علیٰ الاعلان فتویٰ صادر فرمایا کہ بادشاہ مرتد ہوگیا۔ اس کے خلاف جہاد واجب ہوگیا ہے اور جب یہ اعلان حق اکبر کے کانوں تک پہونچا تو اس نے ملا محمد یزدی کو شہید کرا دیا۔

(۶) استاد الملک ملا محمد افضل:

آپ کی پیدائش جونپور میں ۹۷۷ھ میں ہوئی۔ آپ مشہور زمانہ ملا جونپوری کے استاد ہیں آپ ایک جید عالم کے ساتھ ساتھ باعمل صوفی بھی تھے آپ کو درس وتدریس کا بیحد شوق تھا جس کی تسکین

---

[۱] تجلی نور

کے لئے آپ نے ایک درسگاہ بھی قائم کر رکھی تھی۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جس میں ملا محمود جونپوری اور دیوان عبدالرشید بہت مشہور ہیں۔ آپ تصوف پر مبنی فارسی کے بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ آپ اپنے سامنے اپنے لائق ترین شاگرد ملا محمود کی وفات کے بعد بیمار رہنے لگے اور اسی بیماری میں اپنی درسگاہ اور ہزاروں شاگردوں کو چھوڑ کر ۱۰۶۴ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے آپ کا مزار محلّہ چاچک پور جونپور میں ہے۔ [۱]

(۷) ملا محمود جونپوری:

بقول ڈاکٹر شبیر قادری ''صحیح معنوں میں ملا محمود'' ایک جامع کمالات ہستی کے مالک تھے، ہیئت، نجوم، فلسفہ، ریاضی، بلاغت وادب، کے ساتھ ساتھ رقص وموسیقی کی نزاکتوں سے بھی وہ خوب واقف تھے'' ناٹکا بھید ہندوستان کا ایک خاص فن ہے نہ صرف یہ کہ ملا کی دلچسپی اور ذوق کا موضوع تھا بلکہ اس پر ایک کتاب بھی لکھی۔ [۲] آپ ۹۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ دستور کے مطابق دینی تعلیم ملا محمد افضل سے انہیں کی درسگاہ میں حاصل کی آپ کی تصنیف شمس بازغہ (الحکمۃ البالغہ) جو فن بلاغت ومنطق پر محمول ہے ایک ایسی کتاب ہے جس نے آپ کو بین الاقوامی شہرت بخشی اس دور کے علماء کا قول تھا کہ اسلام کے روز اول سے آج تک فلسفہ اور حکمت میں ملا محمود جیسا پائے کا علم دکھائی نہیں دیتا۔ آپ کی وفات ۹۰۶۳ میں ہوئی اور محلّہ چاچک پور جونپور میں مدفون ہیں اور آج ان کے مکان کی جگہ پہ ساجدہ گرلس انٹر کالج جونپور موجود ہے جو اب ڈگری کالج ہو گیا ہے۔

(۸) دیوان عبدالرشید:

دیوان عبدالرشید ملا محمد افضل کے شاگرد خاص اور ملا محمود جونپوری کے ہم عصر تھے۔ استاد کے فیضان صحبت سے آپ نے علوم ظاہری و باطنی پر عبور حاصل کیا آپ نے ایک خانقاہ قائم کی

---

[۱] تجلی نور ص ۴۴۰

[۲] ڈاکٹر شبیر قادری - عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں ص ۲۰۷

جو خانقاہ رشیدیہ کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ آپ کے نام سے ایک محلّہ رشید آباد بھی موجود ہے۔

آپ ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے آپ جید عالم کے ساتھ ساتھ درویش صفت بزرگ اور صوفی تھے۔ آپ نے مختلف موضوع پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں جس کے بارے میں ڈاکٹر شبیر احمد قادری اپنی کتاب (عربی زبان وادب عہد مغلیہ) میں رقم طراز ہیں کہ

''شیخ عبد الرشید کی تخلیقات'' فکر و فلسفہ، اخلاق وتصوف کے فنون پر مشتمل ہے فن مناظرہ میں الرشیدیہ کے علاوہ ''شرح ہدایۃ الحکم'' شیخ اکبر کی ''اسرار المخلوقات'' اور اسی طرح فارسی میں ان کا ایک دیوان شعر بھی مشہور ہے۔ آپ کی وفات ۱۰۸۳ء میں ہوئی اور آپ اپنے ہی نام سے موسم محلّہ رشید آباد میں مدفون ہیں'' [۱]

ملا جیون جونپوری:

آپ کا نام شیخ احمد تھا۔ مگر آپ نے ملا جیون کے نام سے شہرت پائی۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے آپ کو استاذ مقرر کیا۔ ملا جیون سے اورنگ زیب بہت متاثر تھا اور خود اس کی زندگی پر ملا جیون کی تربیت کا اثر نمایاں تھا۔ درس وتدریس کے ساتھ ساتھ آپ صاحب قلم بھی تھے آپ نے مندرجہ ذیل معرکۃ الآراء کتابیں تصنیف کیں۔

(۱) تفسیرات الاحمدیہ فی بیان آیات القرآنیہ

(۲) آداب احمدی (اسرار وسلوک میں)

(۳) نور الانوار۔

(۴) رسالہ علم تجوید۔

(۵) مثنوی فارسی بطرز مولانا روم جس میں پچیس ہزار اشعار تھے

(۶) مناقب الاولیاء

---

[۱] ڈاکٹر شبیر قادری - عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں ص ۲۰۸

اس کے علاوہ اورنگ زیب کے فتاویٰ عالمگیر جیسے علمی کارنامے کی تالیف میں علوم اسلامی پر مکمل دسترس رکھنے والی جن ۳۲ علماء کرام نے حصہ لیا تھا اس میں صرف جونپور ہی کے چار علماء کرام شامل تھے۔

(۱) ملا محمد حسین جونپوریؒ۔ آپ عہد شاہجہانی میں پہلے جونپور اور بعد میں الہ آباد کے قاضی تھے اور فتاویٰ عالمگیری کی تالیف وترتیب میں نائب افسر اعلیٰ کے عہدے پر تھے۔

(۲) علامہ جلال الدین محمدؒ مچھلی شہری جونپوری۔ آپ جونپور کی تحصیل مچھلی شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ فتاؤں کی تالیف وترتیب میں معاون کے عہدے پر فائز تھے۔

(۳) قاضی عبدالصمد جونپوری۔ جو فتاویٰ عالگیری کی تدوین وتالیف میں شامل تھے۔

(۴) علامہ محمد جمیل صدیقی جونپوریؒ۔ آپ بھی فتاؤں کی تالیف وترتیب میں معاون کے عہدے پر فائز تھے آپ مفتی محلّہ جونپور میں مدفون ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کتابوں کے مصنف بھی تھے۔[۱]

ان کے علاوہ شرقی دور میں قاضی نظام الدینؒ، ملا خیر محمدیؒ، خواجہ عیسیٰ تاجؒ، مخدوم شیخ بہاؤالدین چشتیؒ، شیخ دانیال جعفریؒ، شیخ شمس الحق حقانیؒ، شیخ داؤدؒ، مخدوم شاہ اڑہن چشتیؒ، حضرت دیوان شاہ، حضرت مخدوم بندگی، حضرت شاہ مدارؒ، مخدوم شاہ رکن الدین شہروردیؒ یہ بزرگ حضرات ہیں جن کے مدرسوں کے فیض حدود شرقیہ (جو قنوج سے بنگال اور نیپال سے بندیل کھنڈ تک پھیلی ہوئی تھی) سے نکل کر دور دراز کے علاقوں تک جاری رہا اور سچ پوچھا جائے تو مشرقی حکومت کی اصل کامیابی اور شہرت کا سہرا انھیں علماء کرام کے سر ہے آج ان کے درسگاہوں کا وجود نہیں مگر ان کے نام سے جونپور کے محلے، ملاٹولہ، مفتی محلّہ، مخدوم شاہ ادہن، میر مست، خواجگی ٹولہ، اجمیری، ار.....، فیروز شاپور، رشید آباد، رسول آباد، وغیرہ جہاں زبان حال سے ان کی تاریخ دہرا رہے ہیں وہیں جونپور کی شرقی دور کی عمارتیں، اٹالہ مسجد، جامع مسجد، لال دروازہ اور اس سے متعلق عمارتیں اور خانقاہیں دور شرقیہ کی گئی گذری شان شوکت بیان کر رہی ہیں۔ شاہان شرقیہ کا آخری فرمانروا حسین شاہ شرقی ۱۴۵۸ء تا ۱۵۰۵ء نے اپنے

---

[۱] ڈاکٹر شبیر احمد قادری - عربی زبان وادب عہد مغلیہ میں ص ۱۳۷

سینتالیس سالہ دور حکومت میں جونپور کو ہر طرح سنوارنے سجانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی بلا شبہ وہ جونپور کا عہد زریں تھا۔ دربار علماء، فضلاء، شعراء سے بھرا تھا اس دور میں فنون لطیفہ کی بھی سرپرستی ہوتی اور فن موسیقی کی بھی راگ جونپوری خود حسین شاہ شرقی کی ایجاد ہے جس کو ہندوستانی موسیقی میں آج بھی ایک مقام حاصل ہے۔ اس کے عہد کا جونپور صحیح معنوں میں سیکولر مزاج کا نمونہ تھا۔ اس زمانے میں ہندی اور دیگر زبانوں کو بھی ترقی ہوئی۔ شیخ علی متقیؒ، سید محمد مہدیؒ، عالم جونپوری شیخ نبی جونپوری صاحب دیوان شاعر پیدا ہوئے۔ اس وقت کے شاعر ودیاپتی نے اپنی کتاب ''کیرت لتا'' میں آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

> ''یہ شہر جونا پور آنکھوں میں پیارا اور دھن دولت کا خزانہ ہے جونا پور دیکھنے میں سندر اور تمام آرائشوں سے مزین ہے۔ کنویں، تالاب، بکثرت پتھروں کا فرش اندر اندر پانی نکل جانے کا راستہ، آم، جامن کے درختوں کی قطاریں یہاں بھونروں کی گونج من کو موہ لیتی ہے'' [1]

افسوس حسین شاہ امن پسند بادشاہ ہونے کے باوجود اپنی بیگم کی خواہش پر (کہ دلی کے بغیر ہماری سلطنت نامکمل ہے) دلی پر حملہ کر دیا۔ بادشاہ دلی سندر لودی نے حسین شاہ کو شکست دے کر اور کچھ دور تعاقب کر کے چھوڑ دیا۔ مگر حسین شاہ تیاری کر پھر دلی پر حملہ آور ہوا اور اب کی بار بہلول لودی نے اس مہم کو ہمیشہ کے لئے سرد کرنے کے لئے حسین شاہ کا جونپور تک پیچھا کیا اور اس نے انتقام کی آگ میں شرقی سلطانوں کے محلات کے ساتھ ساتھ عمارتوں، کتب خانے، مدرسے، خانقاہوں کو ملبے کے ڈھیر میں دفن کر دیا۔ اور جب شرقی خاندان جامع مسجد میں قلعہ بند ہو گیا تو مسجد کے شرقی گیٹ کو گولہ باری کے ذریعہ منہدم کر کے سب کو تہہ تیغ کر دیا اور جو کچھ شرقی یادگاریں آج باقی بچی ہیں اس وقت کے علماء وصوفیا کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ جامع مسجد جونپور کا ٹوٹا ہوا دروازہ پانچ سو سال بعد مسلمانان جونپور آج دوبارہ

---

[1] ودیاپتی - کیرت لتا

اسی انداز میں تعمیر میں لگے ہیں جو تکمیل کے قریب ہے۔

مغل دور میں بھی جونپور اپنے علم وکمال اور سیکولر فکر کے لئے مشہور تھا۔ اکبر اعظم نے یہاں کئی بار دربار لگائے اور گومتی ندی پر شاندار پل تعمیر کرایا جو آج شہر کے دونوں حصوں کو ملاتا ہے۔ شاہجاں نے ہی جونپور کو شیراز ہند کا خطاب دیا۔ اور اورنگ زیب کے دور حکومت میں شرقی دور کی شان وشوکت کو ایک بار پھر چار چاند لگنا شروع ہوا۔ پرانے مدرسے اور خانقاہیں آباد ہوئیں اور نئے نئے مدارس وخانقاہیں بنائی گئیں اور ہر ایک کو شاہی وظائف جاری ہوئے۔ مگر اورنگزیب کی دکن میں مشغولیت کے باعث صوبہ دار برہان الملک سعادت علی خان نیشاپوری نے، الہ آباد بنارس، غازی پور اور جونپور کے تمام نئے اور پرانے مدرسوں اور خانقاہوں کے وظائف ہمیشہ کے لئے ضبط کر لئے جس کی وجہ سے جونپور کے علمی وادبی مراکز کی رونق پھر ماند پڑنے لگی۔

مغلوں کے زوال کے بعد جنگ آزادی کی پہلی لڑائی جو ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی اس میں جونپور کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ راجہ درادت جہاں، امر سنگھ، بخت سنگھ، راجہ مظفر جہاں وغیرہ نے اپنے جان ومال کی بازی لگادی۔ ان کی جائدادیں ضبط کی گئیں اور ان کے سیکڑوں اعزا واقربا کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔

جونپور ہی کے مصطفیٰ حسن تنظیمی نے اپنی تقریروں اور سرگرمیوں سے جنگ آزادی کے سپاہیوں کی حمایت کا جذبہ عام کیا تو اس جرم میں انگریزوں نے ان کو گرفتار کر کے اور سزائے موت سنا کر رنگون بھیج دیا اور ۱۹۲۱ء میں سزا کو تخفیف کر کے عمر قید میں تبدیل کر کے ان کو کالا پانی بھیج دیا اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

انگریزوں کے اس افراتفری کے دور میں بھی جونپور کی ادبی وعلمی سرگرمیاں جاری رہیں جس کے باعث ہر فن میں سیکڑوں نامور ہستیاں آج تک پیدا ہوتی رہی ہیں جہاں ماضی قریب کے علماء مولانا کرامت علی جونپوری، مولانا شیث جونپوری، مولوی حامد حسن وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ وہیں بہترین

حفاظ میں حافظ امام الدین، حافظ محمد صدیق، حافظ محمد یعقوب اتیق جونپوری کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔فن خطاطی میں سید مظفر جہاں جیسے بے مثال خطاط پیدا ہوئے مولانا کرامت علی شاہ جو صاحب کرامت بزرگ تھے اور جنھیں مصلح بنگال وآسام کہا جاتا ہے اور جن کے ہاتھوں پر ہزاروں بندگان خدا مشرف بہ اسلام ہوئے۔خوش نویسی کے ماہر تھے۔

ادباء اور شعراء کی ایک لمبی فہرست ہے سب کا ذکر ناممکن ہے صرف ان کے تذکرے پر اکتفا کرتی ہوں جو آج بھی علم وادب کی شمع روشن کئے ہیں یا علمی وادبی دنیا میں اپنے نقوش چھوڑ گئے ہیں۔

ہندی شعراء میں نور محمد کامیابؔ جرحدی جون پور''اندراوتی''''انوداگ بانسری''''اور نل دمن'' جیسی معرکۃ الآرا کتابوں کے مصنف ہیں۔حیدر بخش، حفیظ جونپوری (جو امیر مینائی کے شاگرد تھے۔حکیم شفا (جو داغ کے شاگرد تھے)، ہاشم جونپوری جو شاعری کے ساتھ ساتھ فن تاریخ گوئی کے بھی ماہر تھے آئسی جون پوری، شاہ محمد عثمان قدامیؔ (جسٹس سلیمان کے والد) فخر شرقی شفیق جونپوری، سلامؔ مچھلی شہری، کامل شفیقی اور وامق جونپوری اور غلام سمنانی جیسے عبقری لوگ اسی سرزمین سے پیدا ہوئے۔

ادبی اور درس وتدریس کی دنیا میں پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر رشید احمد صدیقی، نیاز احمد صدیقی وغیرہ کا نام محتاج تعارف نہیں۔

اس کے علاوہ جونپور کے مشہور قصبات، مڑیاہوں، مچھلی شہر، کج گاؤں، ظفرآباد، کھیتا سرائے، صبرحد اور شاہ گنج میں علماء فضلاء وحفاظ وقراء اور ادیب وشعراء کی ایک لمبی اور قابل رشک فہرست دیکھی جاسکتی ہے اور بقول وامق جونپوری کے

''بہرکیف جونپور اپنی قدیم روایتی شہرت کو اپنی امرتی، خربوزہ، مولی، مکائی بالی، چمیلی کے تیل اور عطریات کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہے'' [1]

---

[1] وامق جونپوری۔گفتنی ناگفتنی ص ۳۱

باب دوم

وامق جونپوری کے سوانحی حالات

وامق جونپوری کے سوانحی حالات

آپ کا پیدائشی نام احمد مجتبیٰ زیدی اور وامق تخلص تھا۔ آپ ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو جونپور کے ایک مشہور قصبے کچ گاؤں میں پیدا ہوئے تھے آپ کے مورث اعلی سید بڑے میر خواجہ بصیر الدین چراغ دہلوی سے بیعت تھے حضرت چراغ دہلوی نے ان کو بغرض تبلیغ واصلاح اس تاکید کے ساتھ پورب کی طرف سفر کرنے کا حکم دیا کہ وہ ایک جگہ جسے سرسونڈہ کہا جاتا ہے تلاش کریں اور اسے اپنی تبلیغ کا مرکز بنائیں ۔ اپنے پیر کے حکم کو سر آنکھوں پر لیا اور مہینوں سفر کی سخت منزلوں کو طے کرتے ہوئے سرسونڈہ پہنچے اور وہاں ایک تالاب کے کنارے فروش ہو گئے ۔ تالاب کے کنارے اسباب دنیا سے بے نیاز جب ایک بزرگ کو عوام نے دیکھا تو ان کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے اور آپ نے تعلیم وتربیت کا کام شروع کر دیا اور آخر عمر تک اپنے فیوض برکات سے مالا مال کرتے رہے آپ ہی نے سرسونڈہ کا نام بدل کر سادات سونڈہ رکھا۔

بقول وامق کے

''ہمارا گاؤں کچگاؤں جونپور سے دو سال بڑا ہے فیروز شاہ تغلق نے قلعہ جونپور کی بنیاد رکھی تو موضع سادات سونڈہ دو سال کی عمر کو پہنچ چکا تھا'' [1]

جیسا کہ مشہور ہے کہ سید بڑے میر کی دسویں پشت میں سید حسنی اور ان کی اہلیہ کا اچانک انتقال ہو گیا دونوں میں بے پناہ محبت تھی گاؤں کے ایک ٹیلہ پر جب دونوں حضرات کی تدفین ہوئی تو دونوں قبریں اس طرح ایک دوسرے کی طرف جھک گئیں جیسے دو لیٹے ہوئے آدمی ایک دوسرے سے کروٹ لے کر باتیں کر رہے ہیں (یہ قبر آج بھی دیکھی جاسکتی ہے) اس واقعہ کے بعد قبر جھکنے کی

---

[1] وامق جونپوری۔ گفتنی ناگفتنی

مناسبت سے لوگ اسے سادات سونڈہ سے ٹیڑ ہواں کہنے لگے اور پھر بعد میں اہل علم حضرات نے ٹیڑ ہواں کا ترجمہ کجگاؤں کر کے سرکاری کاغذات میں بھی اندراج کرادیا۔ اور اس طرح ٹیڑ ہواں سے کجگاؤں ہوگیا۔

وامق نجیب الطرفین سید تھے۔ آپ کے مورث اعلیٰ سید بڑے میر صاحب (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) کا سلسلہ نسب اکتسویں پشت حضرت علیؓ خلیفہ چہارم سے ملتا ہے۔ جس کی تصدیق ان کے شجرۂ خاندانی سے ہوتی ہے۔ جسے انھیں کے خاندان کے سید محمد جعفر مرحوم نے دسمبر ۵۶ء میں کراچی سے شائع کیا تھا۔ اور وامق صاحب کا یہ خاندانی شجرہ آج بھی ان کے کتب خانہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

وامق صاحب زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں پشتوں پہلے سے علم وادب کا چرچا تھا اور ان کے خاندان کے بہت سے لوگ انگریزوں کے دور میں اعلیٰ عہدے پر مامور تھے۔ وامق کے دادا مولانا مجتبیٰ صاحب اپنے زمانے کے باکمال عالم تھے اور انھیں عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت پر عبور تھا۔ ساتھ ہی ساتھ علم نجوم پر بھی قدرت حاصل تھی اردو میں علم نجوم پر ایک کتاب بھی النجوم کے نام سے لکھی تھی یہ کتاب شائع بھی ہوئی مگر تلاش بسیار کے بعد بھی اس کی کوئی جلد دستیاب نہ ہوسکی۔

وامق صاحب کے والد سید مصطفیٰ زیدی خاندان میں پہلے گریجوٹ تھے انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کیا اور والد کے زیر اثر انھوں نے بھی نجوم پر دسترس حاصل کی یہاں تک کہ وہ کنڈلی بھی بنا لیتے تھے۔ بی اے کرنے کے بعد سرکاری ملازم ہوئے اور بحیثیت ڈپٹی کلکٹر پہلی تقرری فیض آباد میں ہوئی اور آخر میں بریلی سے ایڈیشنل کمشنر ریٹائر ہوئے ۱۹۱۴ء میں ان کو خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔

بقول وامق کے

''پہلی جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی سپاہیوں کی بھرتی اور رسد جنگ کی برآمدگی اور کارکردگی اس وقت معیاری کارگزاری سمجھی جاتی تھی چنانچہ بابا نے ان کاموں میں بڑا نام

کمایا محض آٹھ برس کی مختصر مدت میں خاں بہادری کا خطاب حاصل کیا حکومت کی نظر میں وہ بہت معزز اور معتبر تھے'' [۱]

وامق کے دادا سید محمد مجتبیٰ کے بنائے ہوئے زائچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وامق اپنے آبائی مکان میں واقع کجگاؤں میں ۲۳/اکتوبر ۱۹۰۹ء کو اشرف النساء بی بی بنت ربد العابدین رئیس کجگاؤں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ وامق پیدائشی طور پر کمزور تھے اور اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ ان کی پرورش میں ان کی دادی کا زیادہ ہاتھ تھا اسی لئے وامق اپنی ماں کو'' بُو بُو'' اور دادی کو اماں کہتے تھے۔

پانچ سال کی عمر میں بغدادی کے ساتھ اپنی والدہ کے چچا میر ریاض علی صاحب سے تعلیمی سلسلہ کا آغاز کیا مگر جلد ہی ۱۹۱۳ء میں وامق صاحب کے والد کا تبادلہ فیض آباد سے سلطان پور ہوگیا تو گھر کے سبھی افراد کو سلطان پور بلا لیا اور وہاں ایک ماسٹر کے ذریعہ وامق کا باقاعدہ تعلیمی سلسلہ شروع ہوا مگر دو ہی سال بعد ان کے والد کا تبادلہ بارہ بنکی ہوگیا اور یہ لوگ بذریعہ ریل بارہ بنکی پہنچے۔ ٹرین سے سفر کا یہ پہلا اتفاق تھا جس کا ذکر وامق نے دلچسپ پیرائے میں کیا ہے۔

وامق شروع میں کوئی اچھے طالب علم نہیں تھے اور نصابی کتابوں سے ہمیشہ دور بھاگتے تھے جس کے باعث وہ اکثر فیل بھی ہو جایا کرتے تھے اور اپنے ہم جماعت و گھر کے افراد کے سامنے شرمندہ بھی ہوتے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ

''اپنے متعلق ایک بات صاف کر دوں تاکہ آئندہ حالات میں بار بار اس کو دہرانے کی ضرورت کم واقع ہو اور مجھ کو اور میرے حرکات وسکنات کو سمجھنے میں آسانی ہو مجھ کو پڑھنے لکھنے سے دلچسپی ذرا کم ہی تھی کھیل کود اور سیر و سپاٹے میں زیادہ دل لگتا تھا وہ بیشتر کتابیں پسند نہ آتیں جو داخل نصاب ہوا کرتیں۔ غیر نصابی کتابیں اور مشاغل زیادہ مرغوب تھے تعلیم ختم ہونے تک یہی حال رہا نتیجتاً امتحان میں

---

[۱] وامق جونپوری۔ گفتنی ناگفتنی

خوب فیل ہوتا تھا'' [۱]

وامق صاحب کو مطالعے کا بچپن سے بیحد شوق تھا وہ اپنے پسند کی کتابیں اور رسائل دوسری جگہوں سے بھی حاصل کر کے اپنے شوق کو پورا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ مضمون نگاری، نقشہ نویسی، مصدری وغیرہ کے امتحانات میں اچھے نمبر حاصل کر کے انعام حاصل کیا کرتے تھے جیسا کہ وہ خود رقمطراز ہیں:

''میں پڑھتا بہت تھا مگر اپنی پسند کی کتابیں ایسے پرچے جن کا نصابی کتابوں سے تعلق نہ ہوتا اچھے نمبر لاتا مثلاً مضمون نگاری، ترجمہ نقشہ کشی، تصویر کشی وغیرہ'' [۲]

گھر پر اردو فارسی کی تعلیم اور عربی اور حساب کی ابتدائی تعلیم کے بعد ان کا داخلہ بارہ بنکی ہائی اسکول میں ہوا جہاں انھوں نے ۱۹۲۶ء میں ہائی اسکول کیا اور گورمنٹ کالج فیض آباد سے ۱۹۲۹ء میں سائنس کے ساتھ انٹر کیا۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں B.Sc میں داخلہ لیا ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ انجینئر بنیں مگر والد کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی اور انھوں نے سائنس جیسے مضمون کو چھوڑ کر بی اے میں داخلہ لیا فیض آباد میں ہوسٹل میں رہتے تھے ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔

اور اپنی اسی افتادِ طبع کے باعث انھوں نے چھ سال بعد یعنی ۱۹۳۵ء میں بی اے کیا اور پھر ایل ایل بی میں داخلہ لیا اور اس میں انھوں نے فائنل میں فرسٹ ڈویزن پاس کیا۔ وہ اپنے دوران تعلیم جن اساتذہ سے متاثر نظر آتے ہیں ان میں سب سے زیادہ پروفیسر، ڈی۔ پی۔ مکرجی نمایاں ہیں۔

پروفیسر ڈی پی جی مکرجی کے بارے میں خود وامق رقمطراز ہیں

''چند احباب کی ہمراہی میں مجھ کو پروفیسر ڈی، پی جیسا خضر راہ مل گیا ان کی قربت وصحبت نے آزادی فکر ونظر کے وہ راستے دکھائے کہ روایات اور ان کے تضادات کی

---

[۱] وامق جونپوری۔ گفتنی ناگفتنی

[۲] وامق جونپوری۔ خودنوشت

گتھیاں ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگیں ان کی مقناطیسی شخصیت اور ارشادات نے میرے سیاسی، سماجی، فنی اور جمالیاتی شعور کو وہ جلا بخشی جس کی روشنی میں آج تک ضیاء حاصل کر رہا ہوں دھیمی آواز نرم لہجے میں ان کی عالمانہ گفتگو نے میرے زندان ذہن میں ایسے دریچے کھول دئے تھے کہ الجھنیں دور ہونے لگیں تھیں اور قومیت کی غلامی فصیلوں میں دراڑیں پڑی دکھائی دینے لگیں تھیں موصوف اقتصادیات کے استاد تھے اور جمالیات، فنون لطیفہ اور سیاست کے ماہر تھے وہ بڑے قوم پرست اور انقلاب پسند تھے، وہ بڑا دردمند دل رکھتے تھے اور انتہائی نرم مزاج ہونے کے باوجود اصول اور نظریات کے معاملے میں کسی سے بھی سمجھوتہ کرنے کو جرم تصور کرتے تھے۔ ان کے جاننے والے ان کو یونانیٹ کا ایک نمونہ سمجھتے تھے مگر فی الواقعہ وہ شانتی نیکیتن کی اس روح کی نمائندگی کرتے تھے جو گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور کے خوابوں میں رواں دواں تھی۔ چہرے بشرے کے گرد آزاد فغا کا ہالہ نظر آتا تھا''[1]

پروفیسر ڈی بی مکرجی کے بعد جس دوسری شخصیت سے وامق سے زیادہ متاثر ہوئے وہ ڈاکٹر ظہیر حسین کی تھی جو سائنس کی دنیا میں ایک مقام رکھتے تھے۔ ڈاکٹر ظہیر حسین، سجاد ظہیر (بنے بھائی) کے بڑے بھائی تھے۔ وامق نے جب B.Sc میں داخلہ لیا تھا تو دو سال تک ان سے آرگینک کمسٹری پڑھی تھی۔ اس کے علاوہ سجاد ظہیر سے دوستی اور قربت کے باعث بھی حسین ظہیر سے قریبی تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر ظہیر پکے کانگریس بھی تھے وہ کانگریس کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے کانگریس کے جلسوں میں شریک ہوتے جس کے باعث جیل بھی گئے عملی زندگی میں ڈاکٹر ظہیر حسین سے وامق کو بڑی تحریک ملی۔ خود وامق کے لفظوں میں

''یہ اس وقت کی بات ہے جب میں شعر کہنے لگا تھا۔ اور آل انڈیا ریڈیو سے

---

[1] وامق جونپوری۔ گفتنی ناگفتنی

میرا کلام نشر ہوا تھا۔ ایک مشاعرہ میں ڈاکٹر حسین ظہیر سے میری ملاقات ہوئی میں مشاعرے سے نکلا تو ڈاکٹر صاحب پورٹیکو میں میرا انتظار کر رہے تھے دیکھتے ہی بولے مجتبیٰ یہاں آؤ تمھیں ہونا وامق اور بڑی شفقت سے گھر لے گئے کہنے لگے تمھیں دیکھا کرتا تھا آج میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور تمھاری شاعری پسند آئی'' [۱]

سجاد ظہیر حلقہ احباب میں انھیں (بنے بھائی) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وامق کے سجاد ظہیر سے قریبی تعلقات تھے انھیں کی وجہ سے وامق ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئے اور آخر وقت تک اس کو اپنے خون جگر سے سینچتے رہے۔ سجاد ظہیر کے انتقال پر ساغر ثعلابی نے لکھا ہے کہ

''ہر چند سجاد ظہیر نے مولانا حالی کی طرح مقدمہ شعر و شاعری نہیں لکھا تھا لیکن اردو ادب میں حالی کے بعد ایک نئی تحریک کے بانی سجاد ظہیر اور صرف سجاد ظہیر تھے'' [۲]

وامق کے زمانہ طالب علمی کی یہ وہ شخصیتیں تھیں جن سے وامق کو تحریک ملی اور اس سے انھوں نے پورا پورا استفادہ کیا۔ اور جس کے باعث تعلیم سے فراغت کے بعد ان کی عملی زندگی میں بھرپور نکھار آیا۔

شادی:

۱۹۳۱ء میں وامق کی شادی ہوئی یہ وہ دور تھا کہ سماج کے کسی طبقے میں لڑکی یا لڑکے سے شادی کی اجازت لینے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ والدین نے جب چاہا اور جہاں چاہا رشتہ طے کر کے شادی کر دی۔ وامق نے خود اپنی شادی کا تذکرہ ہلکے تبسم کے ساتھ یوں کیا ہے۔

''یادش بخیر۔ اس وقت میں بی اے میں پڑھ رہا تھا گھر سے (والد مرحوم) کا خط آیا

۱۔ ایس۔ ایم عباس۔ وامق جونپوری شخص اور شاعر

۲۔ ساغر نظامی۔ آج کل دسمبر ۱۹۷۳ء

کہ چھٹی میں اِدھر اُدھر گھومنے نہ چلے جایئے گا۔ یہاں شادی ہے آیئے گا۔ یہ بھی نہیں لکھا کہ شادی تمہاری ہی ہے چنانچہ میں آ گیا۔ سب لوگ گانے بجانے میں لگے تھے۔ بڑا انتظام دیکھا، پوچھا بھائی کس کی شادی ہے لوگوں نے کہا آپ کو نہیں معلوم جناب آپ ہی کی شادی ہے اور اس طرح شادی ہوگئی۔ [۱]

ان کی شادی خاندان ہی میں ہوئی تھی جن کا نام مضطمہ بی بی تھا۔ شادی کے پہلے بھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی اس کے باوجود خاندانی تربیت اور ماحول کے باعث وہ ہر حال میں ایک وفا شعار بیوی ثابت ہوئیں۔

''یہ بات اکثر دیکھی گئی ہے کہ شاعروں کی شادی شدہ زندگی زیادہ کامیاب نہیں رہتی۔ بیویوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کے شوہر نہایت لا اُبالی ہیں گھریلو ذمہ داریوں سے کوئی واسطہ نہیں، شوہروں کا یہ عذر کہ بیوی اور بچوں کے جھمیلوں سے ان کے تخلیقی کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ لیکن وامق اس معاملے میں خوش قسمت ٹھہرے کہ ان کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا جس سے وامق کی زندگی پرسکون و مطمئن گزری'' [۲]

آخر دو تین سالوں میں ان کی صحت زیادہ خراب ہوگئی اور اسی حالت میں ۱۹۸۷ء میں آپ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے متعلق وامق نے خود بتایا۔

''بڑی نیک تھیں مگر ان کی صحت ہمیشہ خراب رہتی تھی بلکہ جب شادی کر کے آئیں تب بھی بیمار تھیں۔ ٹی بی تو ان کو نہیں تھی مگر پھیپھڑے متاثر تھے جگر بھی کمزور تھا جس کے باعث وہ زیادہ تر بیمار رہتی تھیں'' [۳]

---

[۱] ایس۔ ایم عباس۔ وامق سے ایک گفتگو

[۲] ایس۔ ایم عباس۔ وامق شخص اور شاعر ص ۱۰-۱۱

[۳] وامق سے ایک گفتگو

ماشاءاللہ وامق کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ان کا بڑا لڑکا حشمت مجتبیٰ ڈپٹی چیف انجینئر ہے۔ اور دوسرا باقر مجتبیٰ سینئر سائکالوجسٹ (منٹل ہاسپٹل دہلی میں ہیں۔) اور تیسری چھوٹی بیٹی سائرہ عرف شیریں ہے سب بچوں کی شادیاں ہوچکی ہیں اور سب ماشاءاللہ صاحب اولاد ہیں۔اپنے بچوں میں سب سے زیادہ بیٹی سے پیار کرتے تھے اور انھوں نے ایک نظم میری بچی کے نام سے لکھی ہے جو ان کے کلام کے مجموعہ ''سفر ناتمام'' میں شامل ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

ایک چوتھائی صدی قبل
میری پیاری بیٹی
شیریں
ایک کھلونا تھی مرا
خنکی دیدۂ دل
روشنی شب تار
نرم نازک مرے احساس محبت کی دھنک
میرا ہر لمحہ از یست
اس کے قدموں پہ نثار
اب بھی ہے۔
ایک چوتھائی صدی بعد بھی ہے۔ [1]

پیشہ:

وامق نے تعلیم ختم کرنے کے بعد حصول معاشی کے سلسلے میں اول وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۲ء تک فیض آباد میں وکالت کی فیض آباد کے اس وقت کے مشہور وکیل بابو گنپت سہائے

---

[1] وامق جونپوری-سفر ناتمام ص ۱۱۸

کے وہ جونیر تھے بعد میں گورمنٹ ایڈوکیٹ علی ضامن کے ساتھ لگ گئے ۔ باقاعدہ رجسٹریشن کے بعد کچھ دن انہوں نے تنہا پریکٹس کی اپنے اس پیشے میں ٹھیک سے پیر بھی نہیں جمائے تھے کہ اسی زمانے میں ۱۹۴۲ء میں انہوں نے فیض آباد میں نوچندی کے جلوس میں ایک نظم پڑھی جس کا بنیادی تصور یہ تھا کہ اللہ غلاموں کی عبادت قبول نہیں کرتا۔ اس بارے میں خود وامق کہتے ہیں۔

''میں نے فیض آباد میں ایک نظم پڑھی اس میں تھا کہ تم حسین کا غم کیوں مناتے ہو کیا ماتم کرتے ہو حسین نے کس چیز کے لئے جان دی۔ یعنی آزادی کے لئے غلامی کا جُوا پہنتے اور اس انکار کرنے کے لئے تم تو خود غلام ہو اور غلام کا کیا حق ہے کہ وہ حسین کا ماتم کرے۔ حسین کا ماتم کرنے سے پہلے خود کو آزاد کراؤ''۔ [1]

بس صاحب اس پر شکایت ہوگئی اتفاق سے جو ڈپٹی کمشنر وہاں تھے وہ والد مرحوم سے سینیر تھے اور ان سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ مجھ کو بھی جانتے تھے انہوں نے بلایا اور کہا۔

مجتبیٰ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟

میں نے کہا کیا غلطی ہوگئی؟

وہ بولے یہ نظم دیکھو تم نے وہاں گھنٹہ گھر کے نیچے پڑھی تھی اس کا مطلب سمجھتے ہو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم لوگوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر رہے ہو

میں نے کہا وہ تو بہت محدود ایک طبقہ تھا۔

بولے ہاں ہمیں معلوم ہے شیعوں کو مخاطب کر رہے تھے

میں نے کہا کیا شیعوں کو آزاد ہونے کا حق نہیں ہے؟

بہت ہنسے اور بولے بھائی تم لوگوں کو کوئی نہیں سمجھا سکتا خیریت اسی میں ہے کہ تم چار پانچ ماہ کے لئے اپنا گھر بند کر کے وطن واپس چلے جاؤ ورنہ.....

---

[1] ایس۔ ایم عباس۔ وامق شخص اور شاعر

ویسے بھی وامق وکالت کے پیشہ سے دل برداشتہ تھے۔خود کہتے ہیں ''قصہ مختصر لکھنؤ انجینئر بننے گیا تھا اور وہاں سے وکیل اور انقلابی بن کر نکلا۔دل میں ایک چنگاری دبائے ہوئے فیض آباد وکالت کرنے پہنچا اور شاعر بن گیا۔وکالت کو آزاد پیشہ کہا جاتا ہے مگر میں نے اس کو بہت پابند پیشہ یا موکل کا پابند، محرر کا پابند، عدالتوں کا پابند اور اوقات کا پابند۔[1]

گھر آنے کے بعد دو سال (۴۲ تا ۴۴) ان کے بیکاری میں گزرے ۱۹۴۴ء میں بنارس کے مشاعرے میں اختر انصاری پی،سی،ایس سے جو خود ایک شاعر تھے ملاقات ہوئی۔وامق کے حالات جاننے کے بعد انہوں نے A.D.M بنارس سے شفارش کر کے وامق کو محکم راشننگ میں نوکری دلا دی۔راشننگ افسر بننے کے بعد ان کی تقرری مختلف اضلاع میں ہوتی رہی۔الہ آباد اور بنارس میں وہ باقاعدہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔لوگوں کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ملک آزاد ہوا تو ان کی پوسٹنگ بنارس میں تھی اور اسی زمانے میں کمیونسٹوں نے کانگریس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔وامق چونکہ ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ ممبر تھے لہٰذا گاندھی جی کے قتل کے بعد ۱۹۴۵ء میں انہیں ملازمت سے برخواست کر دیا گیا۔مگر گاندھی جی کے ایک تعزیتی جلسہ میں جب وامق نے اپنی نظم ''میر کارواں'' جذباتی انداز میں سنائی تو جلسہ میں آئے I.C.S. آفسر حفاظت حسین صاحب بہت متاثر ہوئے اور ان کی کوشش سے وامق صاحب ستمبر ۱۹۴۸ء میں بحال ہو گئے۔اور وہ بنارس سے الہ آباد اور الہ آباد سے بارہ بنکی پہنچے وامق کی سیاسی سرگرمیاں پھر شروع ہو چکی تھیں اور اپنی افتاد طبع کے باعث ۱۹۵۰ء میں مستعفی ہو گئے خود فرماتے ہیں کہ

''بس میری اور میرے منسٹر سے پٹری نہیں کھائی یوں سمجھئے میں جو کام کرتا ہوں یہاں تک کہ نوکری میں بھی میرے جو فرائض اسے انجام دیتا آپ کو معلوم ہے؟ میں جس محکمہ

---

[1] گفتنی ناگفتنی

میں تھا وہاں نیچے سے اوپر تک کرپشن تھا میں واحد شخص تھا اس محکمے کے اندر جس نے کہیں رشوت نہیں لی [1]

اصولوں کا، نظریات اور طریقۂ کار کا اتنا اختلاف ہوا وہاں وامق جیسا خوددار انسان وہ بھی کیسے رہ سکتا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں

''۱۹۵۰ء پہنچتے پہنچتے حکومت کے کانوں میں کچھ میری خفیہ سرگرمیوں کی بھنک پہنچ چکی تھی اور کچھ میری ادبی سرگرمیوں پر حکومت کا جامہ کسنے لگا تھا اس لئے بارہ بنکی سے مستعفی ہو کر گھر چلا آیا۔

گھر آنے کے بعد وہ ۱۹۵۱ء تک بیکار رہے اور اپنی زمینداری کا کام دیکھتے رہے مگر ۱۹۵۲ء میں خاتمہ زمیندار کا اثر ہر زمیندار کی طرح وامق پر بھی پڑا اور پریشان ہو کر ایک بار پھر حصول معاش کی تلاش میں نکل پڑے اور دہلی جا کر مکتبہ شاہراہ میں نوکری کر لی مگر یہ نوکری ان کی کفالت نہ کر سکی اور وہ علی گڈھ آ گئے وہاں انگریزی کے پروفیسر محمود حسین کی مساعی سے انجینیر نگ کالج کے سپرنٹنڈنٹ آفس میں جگہ مل گئی اس وقت ذاکر صاحب علیگڈھ کے شیخ الجامعہ تھے جس کا ذکر وامق نے یوں کیا ہے:

''علی گڈھ میں اس وقت ذاکر صاحب کی سربراہی تھی۔ وہ بہت ہی ادب نواز اور ادیب دوست انسان تھے۔ وہاں کی ملازمت ذاکر صاحب کی تائید اور انگریزی کے استد پروفیسر میرے کلام پر انگریزی ادب کے نقطۂ نظر سے تبصرہ بھی کیا کرتے۔ ان کا قول تھا کہ انگریزی زبان میں کوئی اوڈ (Ode) اتنی حسین نہیں لکھی گئی جتنی کی اردو میں مری نظم زمین ہے۔ وہاں میرے احباب کا حلقہ پہلے ہی سے موجود تھا پہنچا تو سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آئے دن شعر و شاعری کے جلسے اور ادبی نشستیں گرم ہونے لگیں

---

[1] ایس۔ ایم عباس - وامق سے ایک گفتگو

وہ گہما گہمی تھی کہ بس لطف آ گیا۔ [1]

مگر افتاد طبیعت سے مجبور وامق صاحب علیگڈھ میں بھی ٹک نہ سکے مصلحت پسندی خوشامد و چاپلوسی ان کے مزاج کے خلاف تھی اور جب علی گڈھ میں ترقی پسند گروپ کے کچھ افراد ذاتی مفاد کے تحت اس سے بغاوت کر بیٹھے تو وامق سے ٹھن گئی اور بالآخر بلاتنخواہ رخصت لے کر ۱۹۶۱ میں علی گڈھ کو خیر باد کہا اور کشمیر چلے گئے۔ وامق خود لکھتے ہیں

''علی گڈھ میں چند نام نہاد شاعروں اور ادیبوں کا ایک ایسا گروہ تھا جس کو وہاں میرا وجود ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ یہ وہ حضرات تھے جو کبھی اپنے نام نمود کے لئے انجمن ترقی پسند مصنفین کے بڑے سرگرم کارکن تھے جس کا شیرازہ بکھر چکا تھا اب اس کو مردہ سمجھ کر اس پر وار کر رہے تھے مگر ارباب تحریک میں وہ نفسانفسی اور انتشار پھیلا ہوا تھا کہ میری صدا صدا بہ صحرا ہو کے رہ گئی'' [2]

انجینیر نگ کالج سری نگر کے اس وقت ڈاکٹر ذکی صاحب پرنسپل تھے ڈاکٹر رئیس احمد کے اصرار پر مجھ کو کشمیر بلا لیا۔ وہاں اسسٹنٹ رجسٹرار کی پوسٹ پر تقرر کر دیا اور وہیں سے ۱۹۷۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے آبائی گاؤں کجگاؤں آ گئے جہاں لکھنے پڑھنے کے علاوہ مختلف مشاغل سے آخر وقت تک اپنے کو بہلاتے رہے کشمیر پہنچنے کے بارے میں اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں کہ

''ڈاکٹر زکی الدین پرنسپل انجینیر نگ کالج سری نگر نے ڈاکٹر رئیس احمد کے توسط سے اسسٹنٹ رجسٹرار کی پوسٹ پر تقرر کر دیا اور وہاں مزید ذہنی و اقتصادی فراغت ملی کچھ مدت بعد ڈاکٹر اظہار حسین نے شعر گوئی پر دوبارہ اکسایا مگر وہاں بھی شعر کہنے کا وقت کم ہی ملتا۔ کالج سے فرصت پا کر تاش کھیلنے سے کب فرصت ملتی تھی کہ شعر کہا جائے۔

---

[1] وامق جونپوری۔ گفتنی ناگفتنی

[2] وامق جونپوری۔ گفتنی ناگفتنی

غرض زندگی کے ایام بے فکری سے کٹتے رہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کشمیر تفریح کی جگہ ہے۔نوکری کی نہیں۔ [۱]

حلیہ وضع قطع:

گورا رنگ، اکہرا بدن، قدرے دراز قد کشادہ پیشانی روشن آنکھیں متناسب قدرے لمبا چہرہ اور دراز زلفیں یہ ہے وامق قلمی تصویر لباس کے معاملہ میں ہمیشہ سادگی برتی ہلکے سفید کپڑے کا کرتا اور چوڑی مہری کا پائجامہ اور اوپر سے کھدر کی جواہر کٹ یہ ان کا عام لباس تھا۔کبھی کبھی شرٹ اور پینٹ میں ملبوس نظر آتے تھے۔

عادات وخصائل:

وامق جہاں ایک طرف نفاست پسند ذہن، کم گو اور حساس واقع ہوئے تھے وہیں ان کا دل بغض، حسد، کینہ اور گھمنڈ سے بالکل صاف تھا۔ حالانکہ وامق نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی ان کے والد ڈپٹی کلکٹر تھے۔خود مختلف اعلیٰ عہدوں پر رہے۔ان کے لڑکے اعلی عہدوں پر فائز ہیں مگر اس کے باوجود ان کے مزاج کی انکساری دولتِ خدائے بخشندہ ہی تھی۔تکبر گھمنڈ اور عصبیت نام کی کوئی چیز ان میں نہیں تھی۔انھوں نے خود اپنے خاندانی ماحول پر جو تبصرہ کیا ہے قابل غور ہے۔

''ایسی باتیں، مثلاً شیخی بڑی بڑی باتیں کر کے جتنا ہیں نہیں اس سے زیادہ اپنے کو ظاہر کرنا یہ کچھ یہاں کا ماحول تھا اور اس کا جسٹی فیکیشن میں یہ جانتا ہوں کہ وہ یہ نہ کرتے تو دوسرے ان کو ختم کر دیتے کیونکہ تصادم زمینداروں میں چلتا رہتا تھا جو جتنا ہوتا نہیں تھا اس سے زیادہ ظاہر کرتا ایک بہت نفسیاتی بات یہ ہے کہ کتا جو بھونکتا ہے آپ کو ڈرانے کے لئے نہیں بھونکنے والا جو خود بھونکتا ہے اس لئے کہ وہ خود ڈرتا ہے بالکل وہی

---

[۱] وامق جونپوری۔گفتنی ناگفتنی

سائکالوجی آدمی میں بھی کام کرتی ہے جب وہ بڑی بڑی باتیں کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ اپنے کو بڑا سمجھتا ہے بلکہ اس لئے کہ دوسرے اس کو بڑا سمجھیں۔ یہ سب چیزیں او رچھوٹا بڑا ہونا سرکاری نوکری میں گھر کے یہ حالات مجھے بچپن ہی سے ناپسند رہیں یہ سب باتیں'' [1]

لیکن وامق کی انکساری اور خاکساری کا یہ مطلب نہیں کہ اپنی عزت نفس اور انا سے بے پروا تھے یقیناً وہ جہاں دوسروں کو عزت واحترام سے دیکھتے تھے اور وہیں انہیں اپنی عزت وناموس اور انا بیحد عزیز تھی۔ اسکی قیمت پر انہوں نے کبھی کہیں اور کسی سے سودا نہیں کیا۔ اسکے نتیجے میں انہیں مختلف مرحلوں پر مختلف پریشانیوں سے ہمکنار ہونا پڑا۔ مگر اس کی انہوں نے کبھی پرواہ نہیں کی۔ وہ دوسروں سے جلدی بے تکلف نہیں ہوتے تھے اس کے پیچھے کسی گھمنڈ یا تمکنت کا جذبہ نہیں تھا بلکہ تقاضائے احتیاط ہوتا تھا کہ جلد بازی میں لیا ہوا فیصلہ کہیں تعلقات میں بدمزگی کا سبب نہ بن جائے اب اسے خودداری احتیاط یا انانیت کوئی بھی نام دیا جاسکتا ہے جس کے لئے وہ مجبور تھے خود وہ کہتے ہیں۔

''میرے خیال میں جو مجھ میں خودداری، ایک انا وایک کھینچی کھینچی سی طبیعت ہے یہ مجھے والدہ سے ملی ہے وہ خودداری کا ایک نمونہ تھیں والد بھی کچھ ایسے ہی تھے بہر حال وہ پبلک میں تھے کسی سے گرم کسی سے سرد، کسی بہانے کی باتیں کرلیں، مگر والدہ کے یہاں ایسا نہیں تھا۔'' [2]

مندرجہ بالا صفات کے باوجود ان کے اندر تساہلی اور سستی پائی جاتی ہے جسے ان کی کمی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ جس کے باعث ان کا کوئی کام اپنی دلچسپی اور شوق کے علاوہ کبھی وقت پر پورا نہیں ہوتا اور اس وقت ٹلتا رہتا جب کرنے کو علاوہ کوئی چارہ نہ رہ جائے۔ انہوں نے خود ایک انٹرویو میں اس کا

---

[1] ایس۔ ایم عباس - وامق شخص اور شاعر

[2] وامق جونپوری - خودنوشت

اعتراف اسطرح کیا ہے کہ

''میں بہت کاہل واقع ہوا ہوں مجھ سے کوئی کام کرنے کو نہ کہئے میری یہی خواہش رہتی ہے کہ کسی طرح فلاں کام اگلے وقت کے لئے ٹل جائے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ٹلا ہوا کام پھر نہیں ہوتا''۔ [1]

ان کی انہیں کمزوریون کے باعث ان کی بہت تخلیقات جس میں انگریزی ڈرامے، لوک گیتیں، بچوں کے گیت کا مجموعہ شاید آج تک عوام کے سامنے نہ آسکا اور اب شاید انکی وفات کے بعد آ بھی نہ سکے۔

افتادِ طبع:

وامق جہاں بے خوف اور حاضر جواب واقع ہوتے تھے وہیں ان کی زندہ دلی اور حاضر جوابی مجلسوں کی جان ہوا کرتی ہے اور اسی باعث وہ اپنے دوستوں میں پیارے اور ہر دل عزیز سمجھے جاتے ہیں دوران طالب علمی ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر خود انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

''الہ آباد یونیورسٹی جولائی میں کھلتی تھی اور لکھنؤ یونیورسٹی یکم اگست کو جب میں الہ آباد میں B.Sc میں داخلہ لیا اسی اثنا میں مسلم بورڈنگ ہاؤس میں جہاں میرا قیام تھا۔ شب تعارف (Introduction night) آ گئی کسی نئے طالب علم کو خبر نہ تھی کہ یہ بلا کب نازل ہونے والی ہے ۲۷۔۲۸ جولائی کی درمیانی شب میں دو بجے ''تازہ واردان بساط عزم پر پانی کے گھڑے اور صراحیاں ٹوٹنے لگیں اور پلنگ الٹے جانے لگے جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ دس پندرہ منٹ تک بادل پھٹ جانے کا منظر رہا۔ ہوسٹل میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا تھا۔ اس کے بعد روشنی ہوگئی اور سب نئے لڑکے مویشیوں کی طرح ہنکا کر ہال میں لائے گئے اور ایک ایک قیدی میز پر کھڑا کیا جانے لگا اس سے انواع واقسام کے سوالات کئے جانے لگے اور ہر جواب پر پرانے اقامت گاہ

---

[1] وامق جونپوری-خودنوشت

قہقہہ لگاتے تھے اور بیوقوف بنانے کی کوشش کرتے تھے، میں اندر ہی اندر جل بھن کر خاک ہورہا تھا کہ میرا نمبر آ گیا کسی نے سوال کیا۔ اپنا نام بتاؤ؟ میں نے جواب دیا کس جرم میں کسی نے کہا بتلاتے ہو کہ نہیں ۔ میں نے کہا one point of order پہلے اپنے سوال کو تہذیب کے دائرے میں لائیے ۔ یعنی دریافت کیجیے کہ آپکا اسم گرامی کیا ہے اور آپ حضرات میں سے ایک یا دو صاحب چور ہیں جنہوں نے میرے بکس کا تالا کھول کر میری ڈائری چرالی ہے میرا یہ انداز گفتگو ان سب کے لئے غیر متوقع تھا۔ بہر حال جھینپ مٹانے کے لئے سب نے زور دار قہقہہ لگایا اور دریافت کیا کہ ''تم کو ہنسنا آتا ہے' جی ہاں مگر بے محل نہیں'' رونا آتا ہے'' کس کے حال پر آپ کے حال پر یا اپنے حال پر؟ گانا آتا ہے'' جی ہاں مگر کوئی سمجھنے والا ہو تب'' ان دندان شکن جواب پر ان میں سے جو حضرات مجھ سے عملی مذاق کرنے کی تیاری کر رہے تھے انہیں میں سے ایک طویل اقامت پھرتیلے بدن اور تقریباً'' میری ہی عمر کا طالب علم بڑھ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا مجھ سے تقریباً چھ انچ اونچا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا کہ میاں تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ میں نے کہا شیراز ہند جونپور کا'' وہاں کس خانوادے سے تعلق رکھتے ہو'' میں نے جواب دیا جس میں بزرگ حضور کے لفظ سے خطاب کئے جاتے ہیں اور خورد آپ اور صاحب سے'' آپکا اسم گرامی؟ خاکسار کو احمد مجتبیٰ کہتے ہیں اور میں نے مزید لقمہ دیا کہ یہ تو ایک طرفہ تعارف ہوا۔ آپ بھی تو اپنا نام نامی ارشاد فرمائیں'' میرا نام محمد اسلم خان رام پوری ہے اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ۔ یارو یہ اصیل ہے چابک اور مہمیز برداشت نہیں کرسکتا اسکو پیار اور صرف پیار سے رام کیا جا سکتا ہے'' میں نے کہا خاں صاحب آپ درست کہتے ہیں ۔ ہم انا پر گردن کٹوا سکتے ہیں

گردن جھکا نہیں سکتے'' اس کے بعد ہال سے نکل کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا'' [۱]

وامق کی متضاد شخصیت پر اوپندر ناتھ اشک کا یہ تبصرہ بھی وامق کے سمجھنے میں مددگار ہوسکتا ہے۔

''دو تین ملاقاتوں میں مجھے احساس ہوا کہ وامق نہایت شائستہ مہذب، مرنجان مرنج قسم کے انسان ہیں ان کے طور طریقوں نے کچھ عجیب سے اعلیٰ نسبی، نجابت اور شرافت ٹپکتی ہے لیکن اس کے باوُ جود وہ نہایت خوددار اور آزاد منش ہیں۔ خواہ جس سنسکرتی نہج والوں کا انکار سن کر مایوسی ہوتی ہو ترقی پسند ادیبوں کی انجمن سے وابستہ رہتے ہوئے بھی ویسے جن سنسکرتی ..... کا صدر بنا کر منظور کر لیتے تو مینج والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن وامق نہیں مانے اور تبھی مجھے افسوس ہوا تھا کہ یہ اوپر سے ڈھیلا ڈھالا آدمی اندر سے کتنا سخت اور مضبوط ہے''۔ [۲]

اور غلام رضوی گردش کا یہ تبصرہ بھی ان کی شخصیات کے خدوخال سمجھنے میں معاون ہوگا۔

''وامق صاحب سچی بات خم ٹھونک کر اور ببانگ دہل کہتے ہیں اور دنیا میں رسوائی مول لیتے ہیں شفیق جونپوری کے کلام پر مقدمہ بہت دباوُ ڈال کر بہت اصرار کر کے لکھوایا گیا اب لے دے ہوری ہے موصوف خواب قسطوں میں دیکھتے ہیں ایک ہی خواب چھ قسطوں میں اور دلچسپ بات یہ کہ مکمل تفصیلات سن لیجئے ویسے زندگی بھی قسطوں میں گزاری، ملازمت بھی قسطوں میں کی اور مضامین بھی قسطوں میں لکھے۔ وامق صاحب کب چٹان کی طرح تن جائیں گے کب موم کی طرح پگھل جائیں گے کچھ بھروسہ نہیں'' [۳]

---

[۱] وامق جونپوری۔ گفتنی ناگفتنی

[۲] ربندر ناتھ اشک نیا دور جنوری ۱۹۹۰ء ص ۱۴

[۳] غلام رضوی گردش۔ نیا دور ۱۹۸۷ء ص ۲

ان کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی کے دو واقعات غلام رضوی گردش نے اس طرح بیان کئے ہیں

''ریل کے سفر کے دوران ان کی سیٹ عین کھڑکی کے سامنے تھی اسٹیشن آیا تو شامت کا مارا ایک چائے والا سامنے آ کر جم گیا اور چلا چلا کر ان کے کان کھا گیا چائے پی لو چائے وہ ٹس سے مس نہ ہوئے تو ان کی طرف قدرے جھکتے ہوئے ہانک لگائی چائے بولو چائے''

وامق نے اسے گھورا

چائے کیوں بولو.....انقلاب بولو.....انقلاب زندہ باد بولو'' [1]

اور دوسرا واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''جگر مرادآبادی کے ساتھ ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کلکتہ گئے ستم ظریفی اسٹیشن پر اترتے ہی دو آدمیوں نے دبوچ لیا۔''ہمیں شک ہے کہ آپ لوگوں کے پاس کوکن ہے تلاشی لینا چاہتے ہیں'' وامق صاحب نے رازداری سے پوچھا''ٹیگور کا نام سنا ہے۔ قاضی نذرالاسلام کا نام سنا ہے؟ پھر جگر کی طرف اشارہ کیا جو کچھ دور وحشت زدہ کھڑے تھے۔ یہ پاگل آدمی جو آپ دیکھ رہے ہیں ..... یہ بہت بڑا شاعر ہے ٹیگور اور نذرالاسلام کی طرح اور میں وکیل ہوں .....تلاشی لینے سے پہلے آپ کو اپنی تلاشی دینی ہوگی .....کہیں ایسا نہ ہو آپ ہمارے سامان میں پلانٹ کر دیں۔ دونوں کی حالات غیر ہوئی تو وامق صاحب نے چوبا بدلا اور بولے ویسے آپ لوگ تلاشی لے سکتے ہیں .....لیکن ہم آپ کی نوکری کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ یہ سنتے ہی دونوں''چھما چاہتے ہیں'' کہہ کر رفو چکر ہو گئے'' [2]

---

[1] غلام رضوی ۱۹۸۷ء ص ۲۱

[2] غلام رضوی - نیا دور

فطری طور پر وامق صفائی وسادگی پسند ہیں وہ روز مرہ کے ہر معاملے میں صفائی وسادگی کو پسند کرتے تھے۔ بقول ایم عباس صاحب کہ

''وامق معاملات میں اتنے صاف گو ہیں کہ وہ اکثر بھول جاتے ہیں کہ موقع ومحل کے لحاظ سے انھیں کیا کہنا چاہئے اور کیا نہیں کہنا چاہئے ان کے لفظوں میں مزاج کی اس خو سے تکلیف بھی ہوئی اور نقصان بھی پہونچا'' [۱]

دوسری جگہ رقمطراز ہیں

''حالانکہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موقع ومحل شناسی آدمی کی دوراندیشی اور معاملہ فہمی کی نشاندہی کرتی ہے لیکن آدمی جتنا صاف ہوتا ہے اتنا ہی بیباک ہوتا ہے اور بے باک آدمی ہر قدم پر مصلحت پسندی، ابن الوقتی تصور کرتا ہے اور ابن الوقت ہونا کردار کی ایک بڑی کمزوری کی نشاندھی ہے'' [۲]

وامق موقع پرستی کے اس دور میں اس سے بے نیاز، صاف اور حق گوئی، بیباکی کے ساتھ خوشگواور ماحول میں اپنی متوسط اور سادہ زندگی کے ساتھ بڑی آن بان سے زندہ رہے۔ انھیں شہروں کے شور ہنگامے سے سخت نفرت تھی گوانھوں نے کشمیر کی وادیوں سے لے کر بڑے بڑے شہروں کی سیر کی تھی مگر وہ گاؤں کی سادی زندگی اور وہاں کے سادہ لوگوں کو کبھی بھلانہیں سکے ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ آسانی سے اپنے من پسند شہر میں آباد ہوسکتے تھے۔ اوراس کے لئے قدرت نے پورے سامان بھی فراہم کیا تھا مگر انھیں دیہات کی زندگی اتنا متاثر کئے تھی کہ وہ آخری سانس تک اپنے آبائی وطن کجگاؤں کو نہ چھوڑ سکے دیہات کی والہانہ زندگی سے ان کے لگاؤ کا نقشہ کچھ اس طرح پیش کیا ہے۔

---

[۱] ایس ایم عباس ص ۴۱

[۲] ایس ایم عباس ص ۴۲

''گاؤں کے کھیت کھلیان، کسانوں کی بے لوث زندگی کچے مکانات وجھوپڑیاں، کھیتوں کے درمیان سے گزرتی پگڈنڈیاں پھولی ہوئی سرسوں فصلوں سے بھرے کھلیان برسات میں ابلتے ہوئے ندی نالے جاڑے میں دروازے دروازے جلتے الاؤ اور اس کی گرد آگ تاپتے اور حقہ گڑگڑاتے کسان یہ سب وامق کو پسند ہیں''

گاؤں کے میلے اور تہواروں میں گائے جانے والے گیت باغوں میں کوئل کی کوکو، پپیہے کی پی کہاں، ساون میں ڈالے جانے والے جھولے اور ان میں گائی جانے والی کجریاں وامق کی من پسند چیزیں ہیں'' [1]

شوق ومشاغل:

وامق کو شکار، کھیل، خوش نویسی، مصوری، باغبانی کا شوق تھا۔ شکار کا شوق انھیں بارہ بنکی سے ہوا جہاں ان کے ایک ماموں بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھے شکار کے رسیا تھے اپنے ساتھ بچوں کو بھی شکار میں لے جاتے تھے اس سے ان کا مقصد بچوں کو نشانے بازی کو ٹریننگ سے تھا۔

وامق چونکہ سب بچوں سے بڑے تھے اس لئے اس موقع سے انھوں نے بھرپور استفادہ حاصل کیا۔ اس کی تفصیل خود انھوں نے اس طرح کی ہے

''چھوٹے ماموں سید حماد علی صاحب بھی بارہ بنکی میں ساتھ رہتے تھے اور شکار کے بہت شوقین تھے۔ رائفل اور بندوق کا نشانہ بہت اچھا تھا وہ ہم سب بچوں کو اپنے ہمراہ شکار پر ضرور لے جایا کرتے تھے کبھی قریب دور از راہ شفقت مجھ کو بھی (جو بچوں کی برادری میں سب سے بڑا تھا) بندوق چلانے کا موقع دیدیا کرتے تھے ۱۹۲۱ء میں مرحوم نے گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی میں پانچویں درجہ میں میرا نام لکھوایا تھا۔ [2]

---

[1] ایس۔ ایم عباس ص ۴۶

[2] وامق جونپوری گفتنی ناگفتنی

آگے مزید فرماتے ہیں

ماموں کے چلے جانے کے بعد ان کے شکاری دوروں کو میں نے سنبھال لیا تھا اب میں اپنے ہم عصروں اور اکبر خاں اردلی کے ساتھ دور دور شکار کھیلنے لگا تھا۔ قصبہ کتنو د کے سامنے گھاگھرا کے کچھار میں بے انتہا شیر گلداز اور ہر چوپائے کا شکار ملتا تھا۔ سانبھرا بارہ سنگھا، بنڈیلا اور بہت فاصلہ پر کبھی کبھی گھڑیال بھی خود بلہرہ ریاست کے اندر قلع سے قریب جھیل انواع واقسام کی مرغابیوں اور مچھلیوں سے پٹی پڑی تھی۔ طویل وعریض اتنی کہ شکار تک پہنچنا بغیر کشتی کے مشکل ہوتا تھا۔ پانی اتنا صاف وشفاف کہ تہ کی مچھلیاں دکھائی دیتی تھیں نشانہ اتنا صحیح ہوگیا تھا کہ سوگز کے فاصلے سے روشنائی کی بوتل اڑا دیا کرتا تھا ''

بچپن سے گزر کر جوانی میں وامق کا یہ شوق اور پروان چڑھا جس کی شہادت ان کے ہال کی درودیواروں پر سجے ہوئے متعدد جانوروں کے سر، سنگیں اور کھالیں دے رہی ہیں۔ ایک حساس دل شاعر ایک اچھا شکاری بھی ہوسکتا ہے اس کا یقین کم ہی آئے گا کیونکہ شعراء کی فہرست میں اس طرح کا طبعی تضاد دیکھنے کو نہیں ملتا مگر کیا کیا جائے وامق کے مختلف شوق اور صلاحیتیں خداداد تھیں۔

بارہ بنکی سے وامق نے بہت کچھ سیکھا۔ اس کی فضاؤں سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا وہاں کی متعدد شخصیتوں سے وامق متاثر بھی ہوئے اور ان سے استفادہ بھی کیا جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں

''بارہ بنکی کے کلچر کو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ اس کے قصبہ رودولی کا کلچر ہے۔ لکھنؤ کے کلچر میں قدرے تصنع ہے۔ جو ہر مرکزی تہذیب میں ہوتا ہے۔ اور جو بارہ بنکی کی تہذیب میں نہ تھا۔ بارہ بنکی کے لوگوں میں اخلاص گھریلو پن اور بے تکان بے تکلفی ملتی ہے اس تہذیب کی چند نمائندہ شخصیتیں یہ ہیں جن سے میرا بچپن اور جوانی متاثر ہوئی۔ چودھری محمد علی چمرو، شاہ حیات احمد، جمیل الرحمٰن قدوائی، سیتا رام وکیل،

چودھری صاحبان پیار، مصطفیٰ کامل قدوائی، انیس باجی قدوائی، اور امجاد بھائی قدوائی وغیرہ [1]

غرض کہ بارہ بنکی سے فیض آباد جانے کی تیاریاں شروع ہوگئیں بارہ بنگی چھوٹنے کا مجھے بڑا غم تھا۔ بارہ بنکی سے مجھے ایک جذباتی لگاؤ رہا ہے۔

ڈاکٹر جعفر عسکری نے ان کی بارہ بنکی سے وابستگی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

''وامق کی خودنوشت میں خصوصیت سے جن مقامات کا تذکرہ ہوا ہے ان میں بنارس، اعظم گڈھ، الہ آباد، بارہ بنکی، جالندھر، بھوپال، امراؤتی حیدرآباد، دہلی، لکھنؤ، علی گڈھ، کشمیر، ممبئی، کلکتہ، تاشقند ماسکو وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔ لیکن دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اپنے وطن کے بعد اگر کسی مقام نے غیر معمولی اور جذباتی طور سے متاثر کیا ہے تو وہ شہر بارہ بنگی ہے جس نے ان کی ذہنی وادبی تربیت میں مرکزی کردار ادا کیا'' [2]

بارہ بنکی سے ان کا جذباتی لگاؤ جنون کی حد تک تھا۔ بارہ بنکی میں گزرے ہوئے لمحوں کی ایک ایک یاد انھیں تڑپاتی رہی ہے اور جسے وہ آخری سانس تک اپنے سینے سے لگائے رہے بارہ بنکی کی یادوں کا جس کرب سے انھوں نے بیان کیا ہے اسے سن کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

''اس وقت انگنت چھوٹی یادیں سر اٹھا رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں'' او نادان تو ہم کو اتنی جلد بھول گیا ہم کو تجھ پر بڑا بھروسہ تھا، تو نے اس لئے ہمارا ذکر نہ کیا کہ ہم کو غیر اہم سمجھتا ہے تو نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تیری شخصیت کی ارتقا میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا مگر یہ تیری غلطی ہے کیا ٹھاکر جے کیرت سنگھ بھٹ ڈپٹی کلکٹر نے پولیس لائن کے

---

[1] وامق جونپوری گفتنی گفتنی

[2] ڈاکٹر جعفر عسکری۔ نیا دور ۱۹۹۰ء ص ۳۱

کھیل کے میدان میں گھونسے مار مار کر تجھے فٹ بال کھیلنا نہیں سکھایا؟ کیا تو علی سیر کے ساتھ فٹ بال کھیلنے میں فخر نہیں محسوس کرتا تھا؟ کیا تو نے بابو کے بڑے بھائی کے ساتھ ہاکی نہیں کھیلی، کیا تو نے شمس الدین کے ٹٹو پر بیٹھ کر گھڑ سواری نہیں سیکھی تھی؟ کیا تو ہر جمعرات کو چنو فقیر کے چکارے پر اس کے فی البدیہہ اشعار نہیں سنے تھے؟ کیا تو نے ملک کے بہترین مقررین مثلاً مولانا سبط حسین صاحب، مولانا ابن حسن صاحب نونروی اور حکیم مرتضیٰ حسین کو پہلی بار یہاں نہیں سنا تھا۔ کیا تو نے کوٹھی اور جریا نالے کے درمیان لمبے میدان میں اپنے ہم جماعت لچھمی نرائن صراف سے کتنکوؤں کے پیچھے نہیں لڑایا کرتا تھا؟ کیا تو ماسٹر کبیر کے ساتھ جریا نالے کے پل کے قریب سے ہو کے گھوسیوں کی جوان اور حسین لڑکیوں کو گوشۂ چشم سے تاکنے جھانکنے نہیں جاتا تھا؟ کیا یہاں کی مٹی نے تیرے سوئے ہوئے جذبۂ انحراف و بغاوت کے شانے نہیں ہلائے تھے؟ [1]

مصوری:

مصوری کا شوق انھیں بچپن سے تھا۔ اپنے اسکول کی کاپیوں پر نقش و نگار بنایا کرتے تھے اس میدان میں ان کے کسی استاد کا ذکر نہیں ملتا بلکہ ان کے شوق اور صلاحیت کا نتیجہ تھا کہ اس میدان میں بھی انھوں نے رسائی حاصل کی۔ گو وہ آرٹ کے اسٹوڈنٹ بی اے میں ہوئے مگر آرٹ کا شوق بچپن ہی سے ان کے دل میں پرورش پا رہا تھا۔ جسے انھوں نے کسی حد تک تکمیل تک پہنچایا۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی رابندر ناتھ ٹیگور غالبؔ، انیس، اقبالؔ، اور اقبال کے خیالی پیکر شاہین کی تصویریں (جیسے وہ دسروں کو دکھانے اور بتانے میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔) دیکھ کر لوگ ان کے شوق اور فن سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

---

[1] واثق جونپوری گفتنی ناگفتنی

خطاطی:

خطاطی یا خوش نویسی ایک ایسا فن ہے جو بغیر استاد اور مشق کے حاصل نہیں ہوسکتا اس لئے اسے سیکھنے کے لئے وامق نے اس دور کے بہترین اور مشہور خوش نویس محلّہ سپاہ جونپور کے ممتاز حسین اور محمد جعفر کو اپنا استاد بنایا اور فیض حاصل کیا۔ یہ دونوں حضرات محلّہ سپاہ ہی کے فنِ خطاطی میں ہر طرح کامل مصنف محمد باقر کے شاگرد تھے۔ ان کی تعریف وامق نے اس طرح کی ہے۔

''خطاطی میں محلّہ سپاہ کے مصنف محمد باقر نے وہ کمالات دکھائے کہ میر علی و میر عماد کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ انھوں نے دو شاگرد بنائے ایک اپنے بڑے صاحبزادے محمد جعفر کو اور دوسرے شیخ ممتاز حسین جونپوری کو اپنی نوجوانی میں میں نے بھی انھیں دو حضرات سے خطاطی کے سبق لئے''[1]

ان کے ڈرائنگ روم میں ان کی خطاطی کے نمونے وصیلوں کی شکل میں دیکھائی دیتے تھے۔ وصلی لکھنا خطاطی کا ایک الگ فن ہے۔ جو ایک قسم کے پیڑ کی چھال پر جسے بھوج پتر بھی کہتے ہیں لکھی جاتی ہے وصلی پر منتخب اشعار لکھے جاتے ہیں۔ اس طرح کی مختلف وصلیاں ان کے ڈرائنگ روم کی زینت تھے۔ خدا جانے آج ان کے بعد ان کے نوادرات کو کس نے کہاں سنبھال رکھا ہے۔ ان کے بعد تو ان کی لال کوٹھی گویا ویران ہوگئی۔ سنا ہے ان کے لڑکے محرم میں اسے زینت بخشتے ہیں کتابت کے ان کے والہانہ شوق کا ذکر غلام رضوی گردش نے اس طرح کیا ہے

''حوصلہ دیکھئے سونا مرگ کشمیر کے پہاڑوں پر چڑھ کر پیڑوں کی چھال اتار لائیں گے پتر بوج کا کاغذ ہلکے بادامی رنگ کا پھر اس پر خطاطی کا کمال دیکھئے۔

موصوف اسی پتر بھوج پر سجع لکھیں گے ''ابن حیدر سبط احمد مجتبیٰ'' اور ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کریں گے'' شاعری جز و نیست از پیغمبری'' لیکن اگر آپ نے بھولے سے

---

[1] وامق جونپوری ۔گفتنی ناگفتنی

اس کاغذ کے بارے میں کچھ پوچھ لیا تو سمجھئے گھنٹہ بھر کی فرصت ہوگئی'' [۱]

اس کے علاوہ ان کو کتب بینی اور مطالعہ کا بیحد شوق بچپن سے تھا جو آخری وقت تک قائم رہا منتخب اور ان کی پسندیدہ دو ایک کتابیں ہمیشہ ان کے سرہانے موجود رہتیں اور جب چاہتے اس سے محظوظ ہوتے اردو اور انگریزی ادب کے ہر موضوع پر کتابوں کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کے ذوق مطالعہ پر غلام رضوی گردش کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں۔

''موصوف پر پڑھنے کا دورہ پڑتا تھا۔ کشمیر میں جب تنہائیاں ڈسنے لگیں تو ریزیڈنسی پارک کے مشرقی کونے پر ویمنس کالج کے سامنے ایک سکنڈ ہینڈ بکس (Books) کی دوکان ڈھونڈھ نکالی جہاں پڑھنے کے لئے کتابیں کرائے پر ملتی تھیں تین دن کا ایک روپیہ اور آٹھ آنا روز۔ دوکاندار کو پندرہ روپئے مہینہ پر پٹالیا اور ساری کتابیں چاٹ ڈالیں'' [۲]

''سرہانے جو کتابیں ہمیشہ رہتی ہیں، جرمنی کا چھپا ہوا دیوان غالب اور آزاد کی آب حیات، جب دل چاہا جہاں سے جی چاہا کھول کر پڑھ لیا ویسے مہدی افادی کے بھی عاشق ہیں۔ مختلف النوع موضوعات پر پڑھنے کا شوق ہے معاشیات غالباً مغلیہ دور کے جونپور کے بہترین خطاط وعمرانیات، سیاسیات، جمالیات ادبیات خرافات سب کچھ پڑھیں گے'' [۳]

اس کے علاوہ وامق کو باغبانی اور شہد کی مکھیاں پالنے کا شوق تھا جسے انھوں نے ضعیف العمری اور کمزوری کے باوجود اپنی آخری سانس تک قائم رکھا۔ لال کوٹھی کے پیچھے مختلف اقسام کے پھولوں

---

[۱] غلام رضوی گردش- نیا دور ۱۹۸۷ء ص ۲۰

[۲] غلام رضوی گردش- نیا دور

[۳] غلام رضوی گردش- نیا دور فروری ۱۹۸۷ء

اور بیلوں سے بھرا ہوا باغیچہ ان کے شوق اور ذوقِ جمال کی گواہی دے رہا ہے۔ وامق جب تک زندہ رہے اسے اپنے ہاتھوں سے سنوارتے رہے۔ بڑھاپے میں وہ خود کھرپی لے کر اس کی گڑائی اور ترائی کرتے اور قینچی لے کر بڑھی ہوئی بیلوں کی تراش خراش کرتے۔ اور جو بھی جاتا بڑی خوشدلی سے اپنے باغیچہ کی سیر کراتے۔ ایک ایک بیل بوٹے کی اقسام اس کی خصوصیت وافادیت پر تبصرہ فرماتے کوٹھی کے باہر دالان میں شہد کی مکھیاں پال رکھی تھیں۔ جس کا مقصد تجارت نہیں بلکہ اپنے لئے خالص شہد حاصل کرنا تھا۔ ہر صاحب ذوق جاننے والے کو اس کی ایک ایک تفصیل بتاتے نہیں تھکتے دیکھئے یہ سپر چمبر ہے اس میں رانی مکھی رہتی ہے۔ یہ براڈ چمبر ہے اس میں مزدور مکھی رہتی ہے۔ یہ دیکھئے یہ خاص مکھی ہے جسے Indiea مکھی کہتے ہیں۔ یہ ہمیشہ ایسی جگہ لگائی جاتی ہے جہاں کوئی دیکھ نہ سکے۔ وامق کے اس شوق کو دیکھ کر سید ایم عباس لکھتے ہیں کہ

''گو وامق کے لئے اب لال کوٹھی کی دیکھ بھال ہی بھاری ہے اور باغ کی دیکھ بھال تو اس عمر میں ان پر ستم بالائے ستم ہے۔ اگر کسی دوسرے شخص کے تصرف میں یہ سب کچھ ہوتا تو شاید وہاں جھاڑ جھنکار ہی نظر آتی وامق کو یہ بھی شکایت ہے کہ کوئی آدمی نہیں ملتا جو باغیچہ کی ٹھیک طور پر پرنگہداشت کرتا۔ مگر اس شکایت کے باوجود بھی وہ باغیچہ کے ضروری کاموں میں تھکن وہراس نہیں محسوس کرتے''[1]

شہد کی مکھیوں کے پالنے کے شوق پر عباس آگے فرماتے ہیں کہ

''باغیچہ سے ملے ورانڈے میں انھوں نے مکھیاں پالنے کے ساز وسامان کا اہتمام کیا ہے۔ کبھی دو کبھی دو سے زیادہ مکھیوں کے دربے (Bee thves) وامق ہمیشہ رکھتے تھے شہد کی مکھیوں سے متعلق تمام ساز وسامان شہد نکالنے کا برتن وغیرہ ان کے شوق کی یادگار ہیں''

---

[1] سید ایس ایم عباس۔ شخص اور شاعر ص ۵

وامق کو مکھی پالن کے سلسلے میں خاص معلومات ہیں مکھیوں کی پرورش ان کی غذا، رہن سہن، شہد کی فراہمی، چھتوں کے نقصان، صفائی ستھرائی وغیرہ کے متعلق وہ اس تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ جیسے انھوں نے اس کام کی ٹریننگ لی ہو اور کلاس میں لکچر دے رہے ہوں'' [۱]

وامق جونپوری مختلف شوق و مشاغل پر غلام رضوی گردش کا یہ بھرپور تبصرہ بھی قابل مطالعہ ہے۔

''باغبانی، مگس بانی، اور خطاطی تو ایک طرف ان کے علاوہ بھی موصوف نے بھانت بھانت کے شوق پال رکھے ہیں، بڑی لوکی اگر ہاتھ لگ گئی تو پہلے اس کو کاٹ کر دو ٹکڑے کریں گے، پھر بیج نکال کر اس کا (Vase) بنائیں گے منی پلانٹ کو شیشے کی بوتل سے نکال کر اس میں منتقل کریں گے جب دیکھی کہ دس پندرہ دن بعد پانی ڈالنے کے بجائے روز پانی دینے کی نوبت آ گئی تو اپنے ہی خیال کو رد کر دیں گے پھر بھی لوکی پھینکی نہیں جائیگی بلکہ اسے دیوار گیر بنا کر نوادرات میں شامل کر دیا جائیگا'' [۲]

کھانے کے معاملے میں وامق کم کھاؤ مگر اچھا کھاؤ کے مقولے پر قائم رہے وہ گوشت اور سبزی دونوں اعتدال کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ غالب کی طرح وہ آموں کے بیحد شوقین تھے۔ مگر ادھر چند برسوں سے اس کے شاکی تھے کہ اب پہلے جیسے تخمی آم پہلے کمیاب اور پھر نایاب، پھر عنقا ہو گئے۔ اس سلسلے میں وہ بچپن اور جوانی میں تخمی آموں کی بہار کو اکثر یاد کرتے۔ ان کے درجنوں نام لطف لے کر بیان کرتے اور کہتے کہ ہر آم کا ایک الگ ہی لطف اور ذائقہ تھا۔ قلمی آموں کو بھی وہ بڑی چاؤ اور نفاست سے کھاتے تھے۔

اسے ٹھنڈا کرتے پھر اسے استعمال کرتے مختلف آموں کو کاٹنے کے لئے ان کے پاس مختلف چاقو

---

۱ سید ایس ایم عباس۔ شخص اور شاعر

۲ غلام رضوی نیا دور فروری ۱۹۷۷ء

اور چھریاں تھیں۔ جو چاندی سے لے کر بانس تک کی بنیں ہوئی تھیں۔ وہ کہتے تھے کہ ایک چاقو سے ہر آم کاٹنے سے آم کا لطف جاتا رہتا ہے وہ جانتے تھے اور اس پر عمل پیرا بھی تھے) کہ کون سا آم کس چھری سے کاٹ کر کھانے میں لطف آتا ہے ان کا یہ بھی خیال تھا کہ لوہے کی چھری سے آم کاٹنے سے اس کا مزا بدل جاتا ہے میٹھا ان کو بے حد مرغوب تھا اور اس معاملے میں وہ انتہاء پسند واقع ہوئے تھے۔ میٹھا دیکھتے ہی ان کی توبہ ٹوٹ جاتی تھی۔ وہ اپنے ڈاکٹر رام چندا پادھیا سے کہتے کہ

''اگر زیادہ میٹھا صحت کے لئے نقصان دہ اور دوسری چیزیں صحت کے لئے ضروری نہ ہوتیں تو میں میٹھا اور صرف میٹھا ہی کھاتا''

وامق صاحب پچھلے تیس پینتیس سالوں سے بے خوابی کے مرض میں مبتلا تھے اور خواب آور دوا کی ایک گولی اپنے ڈاکٹر کے مشورے پر لیا کرتے تھے۔ بغیر دوا کے ان کو نیند نہیں آتی تھی۔ اور اسی حالت میں آخر ایک دن بغیر دوا کے ۲۱ نومبر ۱۹۹۸ء کو ہمیشہ کے لئے ابدی نید سو گئے ان کی موت پر آفاق ناصری نے اپنے مختصر تبصرہ میں بہت صحیح اور بہت کچھ کہہ دیا۔

''ترقی پسند تحریک اور جنگ آزادی کے پس منظر میں وامق نے اپنے شاعرانہ تخلیقی عوامل کے ذریعہ جو کارہائے نمایاں انجام دیئے اس کی داستان پوری صدی پر محیط ہے ان کی کتابِ زندگی میں پوری بیسویں صدی بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ۲۱ نومبر ۱۹۹۸ء کو اس ساحرانہ قد و قامت اور شاعرانہ انفرادیت کے حامل شخص کا انتقال ہو گیا۔ گویا شیراز ہند جونپور کی عظیم شاعرانہ روایات کی آخری کڑی ٹوٹ گئی''۔ [۱]

---

[۱] آفاق فاخری - ایک تبصرہ

باب سوم

اردو میں ترقی پسند تحریک کا پس منظر

اردو میں ترقی پسند تحریک کا پس منظر

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء ۱۹۱۸ء) کے بعد کانگریس کے (اعتدال پسند طبقہ جس کی رہنمائی گاندھی جی کے ہاتھ میں تھی) جنگ میں انگریزوں کا بھرپور ساتھ دینے اور جنگ میں کامیاب ہونے پر انگریز وائسرائے کو مبارکباد دی تو ان کو امید تھی کہ انگریز بہادر ہندوستانیوں کی اس بیش بہا خدمات کے سلسلے میں ہندوستانیوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں تبدیلی لائیں گے اور ان کی نفرت محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا اور کانگریس اور تمام ہندوستانیوں کے ہاتھ مایوسی لگی۔ جس کے نتیجہ میں کشمیر سے کنیا کماری تک ردعمل کے طور پر اس کا زبردست اثر ہوا۔ ملوں میں مزدوروں نے ہڑتالیں شروع کر دیں۔ دوسو سے زیادہ ہڑتالیں ہوئیں جس میں بیسوں لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا۔

۱۹۴۰ء میں کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں ہوا جس میں کانگریس کی قیادت لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے ان کی تقریروں میں بھرپور انقلاب کی آواز گونج رہی تھی۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں زارشاہی کے خلاف زبردست اور کامیاب انقلاب آچکا تھا۔ جس کے اثرات ایشیا اور یورپ میں صاف دکھائی دینے لگے تھے اور ہندوستان بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا اور ہندوستانی عوام نے بھی اشتراکی حکومت کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں پنجاب کے جلیانوالہ باغ کا وہ دردناک حادثہ پیش آیا جس میں جنرل ڈائر نے نہتے ہندوستانیوں پر ایک دو نہیں سولہ سو راؤنڈ جھونک دئے۔ جس سے کانگریس کے اعتدال پسند لیڈروں کے پاؤں بھی ہل گئے اور نتیجے کے طور پر جگہ جگہ سیوا دل کی کمپنیاں قائم ہونے لگیں، ولایتی مال کے بائیکاٹ کی آواز گونجنے لگی ہڑتالیں شروع ہوئیں۔ سرکار نے سیوا دل کو غیر قانونی قرار دیا۔ جگہ جگہ گرفتاریاں ہونے لگیں اور ۱۹۴۱ء کے شروع ہوتے ہوتے ہزار ہا ہزار طالبعلم، مزدور

اور لیڈران جیلوں میں بھر دیئے گئے۔

انقلاب روس سے متاثر ہو کر ہندوستان میں بھی ۱۹۴۰ء میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں اس نے کانگریس کے احمد آباد کے اجلاس میں ایک اعلانیہ شائع کیا تھا کہ

''انقلاب سے ہندوستان کی بنیاد نہیں ہل رہی ہیں اور اگر کانگریس اس کی رہنمائی نہیں کرنا چاہتی ہے تو اسے صرف مظاہروں اور عارضی جوش وخروش پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے اسے چاہیئے کہ مزدور کی سبھاؤں کے مطالبات کو فوراً اپنے مطالبات بنائے اسے چاہیئے کہ کسان سبھاؤں کا جو پروگرام ہے اسے اپنا پروگرام بنائے اور بہت جلد اس کا وقت آئے گا کہ کوئی بھی روکاوٹ کانگریس کا راستہ نہیں روک سکے گی اس کے ساتھ ان عوام کی ناقابل مزاحمت ان کی قوت ہوگئی جو پوری بیداری کے ساتھ اپنے مفاد کے لئے لڑ رہے ہوں گے''[1]

کانگریس کے اسی احمد آباد کے اجلاس ۱۹۲۱ء میں حسرت موہانی نے مکمل آزادی کا ریزرویشن پیش کرنا چاہا۔ جس کو گاندھی جی نے ایک غیر ذمہ دارانہ فعل کہہ کے رد کرا دیا۔ لیکن ۱۹۲۷ء میں کانگریس کا جو اجلاس مدراس میں ہوا اس میں گاندھی جی کسی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے چونکہ اجلاس میں بائیں بازو کا قبضہ تھا اس لئے مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس ہوگیا اور جواہر لال نہرو اور سبھاش چند بوس کانگریس کی سکریٹری منتخب ہوئے۔ گاندھی کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے اس کی سخت مذمت کی اور اسے بغیر سوچے سمجھے ایک عاجلانہ فیصلہ قرار دیا۔ اور بالآخر ۱۹۲۸ء کے کلکتہ اجلاس میں نہرو رپورٹ پیش کر کے اس جدوجہد کو ایک سال کے لئے ملتوی کرا دیا۔ لیکن اس فیصلے کے خلاف مع سبھاس چندر بوس ہزاروں مزدوروں نے مظاہرہ کر کے پنڈال پر قبضہ کر لیا۔ آخر اعتدال پسند لیڈروں کو جھکنا پڑا اور اعلان کرنا پڑا کہ قومی آزادی کی جدوجہد شروع کی جائے اور اس میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔

---

[1] خلیل الرحمٰن اعظمی

اپنے ساتھ فیصلے کے مطابق آخر ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے اپنے لاہور اجلاس میں مکمل آزادی کا ریزرویشن پاس کر کے اپنی منزل مکمل آزادی قرار دی اور اس طرح ۲۹ رجون ۱۹۳۰ء کو سارے ہندوستان میں پہلا یوم آزادی منایا گیا۔

الغرض تقریباً پچاس سال کی اس کشمکش اور جدوجہد کے نتیجہ میں ہندوستان میں سماجی ادبی اور سیاسی بیداری کی ایک لہر دوڑا دی جس کے اثر سے بیسویں صدی کا اردو ادب بھی متاثر ہوا اور اس نے اپنے چہرے سے پرانے طرز کی شاعری، افسانہ گوئی اور قصیدہ خوانی کا نقاب اتارنا شروع کر دی جس کے نتیجے میں اول اول اقبالؔ، حالیؔ آزادؔ، چکبستؔ، اور سرور جہاں آبادی نے ادب کے دھارے کو نیا موڑ دینا شروع کیا اور جن کی نظموں کے نئے رنگ نے ہندوستانی ذہنوں کو بیدار کرنا شروع کیا۔ ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، اور خاں کی تحریروں، الہلال، ہمدرد اور زمیندار کے ذریعہ نوجوانوں کے دلوں پر اپنا سکہ جمالیا اور یہ اخبارات ہر نوجوان کے دل کی دھڑکن بن گئے اور حکومت کے کان کھڑے ہو گئے۔ الہلال، البلاغ، ہمدرد وغیرہ گورمنٹ کی نگاہ میں معتوب ٹھہرے ان کی ضمانتیں ضبط کی گئی پریس بند کئے گئے۔ پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ ''سوز وطن'' ضبط کر کے اس کی ساری کاپیاں نذر آتش کر دی گئیں۔ علامہ شبلی نعمانی کی ہنگامہ خیز نظم بلقان ضبط کر لی گئی مگر اس ظلم وستم اور تشدد کے باوجود ادیبوں اور قلمکاروں نے اپنے دلوں میں ایک نئے عزم اور حوصلے کو جگہ دی اور ان کی قلموں نے وہ جگہ پائی کہ سب نے پُرانی ڈگر چھوڑ کر نئی سمت سفر کی ٹھانی۔ ایک طرف علامہ اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام کی بخیہ ادھڑتے ہوئے۔ لینن خدا کے حضور، ساقی نامہ، فرمان خدا فرشتوں کے نام، اور مسجد قرطبہ جیسی نظموں سے ملک وملت پر فدا ہونے کا جذبہ پیدا کر رہے تھے تو دوسری طرف منشی پریم چند، کرشن چند، حیات اللہ انصاری، قاضی عبدالغفار وغیرہ اپنی تحریروں سے اور حفیظ جالندھری، روش صدیقی جوش ملیح آبادی ساغر نظامی وغیرہ نے اپنی نظموں سے عوام کی بے حس جسموں میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک رہے تھے اور اس طرح پڑھے لکھے نوجوانوں اور

لڑکیوں نے آزادی اور مساوات کے لئے جوش اور حوصلے سے تیاری کرنا شروع کر دیا۔

انقلاب روس اور ہنگامۂ بلقان کے بعد پوری دنیا خاص کر ایشیا میں عوامی بیداری کا جو دھارا پھوٹ پڑا اس نے سب کو احساس دلایا کہ اب کوئی تحریک اپنے علاقائی حدود میں محدود ہو کر نہیں رہے گی اور دیر سویر اس کی بین الاقوامی اثرات مرتب ہو کے رہیں گے اور اس احساس کو مزید تقویت بخشی جرمنی کے ہٹلر نے (۱۹۳۳-۱۹۴۵) ہٹلر کی سربراہی میں فاشزم نے وہ سر اٹھایا کہ دنیا دہل کے رہ گئی وہاں ہزاروں ادیب، آرٹسٹ، سائنس داں، سرمایہ دار یا تو جیلوں میں بند کر دیئے گئے یا جلا وطن کر دیئے گئے۔ سجاد ظہیر جو ہندوستان سے بیرسٹری کی تعلیم کے لئے لندن گئے تھے یورپ میں اپنی ذہنی کیفیت کو اپنی ڈائری میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''ہم کو لندن اور پیرس میں جرمنی سے بھاگے نکالے ہوئے مصیبت زدہ لوگ روز ملتے تھے فاشزم کے ظلم کی درد بھری کہانیاں روز سنائی دیتی جرمنی میں آزادی پسندوں اور کمیونسٹوں کو سرمایہ داروں کے غنڈے طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ وہ ہولناک تصویریں جن میں عوام الناس کے ہر دل عزیز لیڈروں کی پیٹھ اور کولھے کوڑوں کے نشان سے کالے پڑے دکھائی دیتے وہ خوفناک واقعات جو وقتاً فوقتاً کسی بڑے کمیونسٹ لیڈر کے جلاد کے ہتھوڑے سے سر قلم ہوتے ہوئے اخباروں میں چھپتے وہ اندوہ ناک اندھیرا جو علم و ہنر کی اس چمکدار دنیا سے جس کا نام جرمنی تھا پھیلتا ہوا سارے یورپ پر اپنی ڈراونی پرچھائیں ڈال رہا تھا۔ اور ان سب نے ہمارے دل و دماغ کے اندورنی سکون کو مٹا دیا تھا۔ صرف ایک طاقت اس جدید بربریت کا مقابلہ کر سکتی تھی اور وہ تھی کارخانوں کے مزدوروں کی منظم طاقت اس جماعت کی طاقت جو اکھٹا ہو کر کام کرنے سے مسلسل طبقاتی جدو جہد کا تجربہ حاصل کر سکے۔ ایک ایسا انقلابی جماعتی شور پیدا کرتی جا رہی تھی جو اسے سماج کو نیچے کھسیٹنے والی سرمایہ داری کو شکست

دینے اور مستقبل کی تعمیر کا بدرجہ اتم اہل بناتی ۔ پھر آگے رقمطراز ہیں ہم رفتہ رفتہ شوشلزم کی طرف مائل ہوتے جارہے تھے ہمارا دماغ ایک ایسے فلسفے کی جستجو میں تھا جو ہمیں سماج کی دن بدن بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں کو سمجھنے اور ان کو سلجھانے میں مدد دے سکے ۔ ہمیں اس بات سے اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ انسانیت پر ہمیشہ سے مصیبتیں اور آفتیں رہی ہیں اور رہیں گی ۔ مارکس اور دوسرے اشتراکی مصنفین کی کتابیں ہم نے بڑے شوق سے پڑھنا شروع کیا ۔ جیسے جیسے ہم مطالعہ کو بڑھاتے آپس میں بحثیں کرتے تاریخی سماجی اور فلسفیانہ سکوں کو حل کرتے اسی نسبت سے ہمارے دماغ کو روشن کرتے اور ہمارے قلب کو سکون ہو جاتا تھا ۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ایک نئے لامتناہی تحصیل علم کی ابتدا تھی'' [1]

الغرض اس ذہنی کشمکش اور پراگندہ حالات میں لندن میں تعلیم حاصل کرنے گئے چند جوانوں نے سجاد ظہیر کے کمرے میں جس کی حیثیت اسٹڈی روم کی تھی ایک ادبی انجمن بنانے کی ٹھانی اور کچھ دنوں کے غور فکر کے بعد ان نوجوانوں نے انجمن کی تشکیل کے لئے ایک دستور تیار کیا اور اس کا باقاعدہ پہلا جلسہ لندن کے ناں کنگ رسٹوران میں ہوا ۔ اور اس کا نام ''ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن رکھا گیا ۔ (Indian progessive writers association) رکھا گیا ۔

اس کے پہلے صدر ملک راج آنند ہوئے ۔ انجمن کا دستور یہ تھا کہ ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں ۔ پرانے معتقدات اور خیالات کی جڑیں ہلتی جارہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کو تعمیر و ترقی پر لگانے میں معاون ہوں ، ہندوستانی ادب قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپا ہے نتیجہ یہ ہے کہ

---

[1] سجاد ظہیر نیا ادب جنوری ۱۹۴۱ء خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۴۰

وہ بے روح و بے اثر ہوگیا ہے۔ ہیئت میں بھی اور معنی میں بھی اور آج ہمارے ادب میں بھگتی اور ترک دنیا کی بھرمار ہوگئی ہے جذبات کی نمائش عام ہے عقل وفکر کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے بلکہ رد کر دیا گیا ہے پچھلی دو صدیوں میں اس طرح کے پیشتر ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ جو ہماری تاریخ کا انحطاطی دور ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پسندوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے انھیں زندگی اور واقفیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے اور تخلیقی وتنقیدی انداز سے ان سبھی باتوں کی مصوری کریں گے جن سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہئے اور وہ ہے ہماری روٹی کا بدحالی کا ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال۔ ہم اسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہوگی وہ سب کچھ جو ہم میں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے قدامت پسندی ہے اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے جو ہمیں اپنی عزیز روایات کو بھی عقل وادراک کی کسوٹی پر پرکھنے کو اکساتا ہے جو ہمیں صحتمند بناتا ہے اور ہم میں اتحاد و یک جہتی کی قوت پیدا کرتا ہے اسی کو ہم ترقی پسند کہتے ہیں ان مقاصد کو سامنے رکھ کر انجمن نے مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی ہیں۔

(۱) ہندوستان کے مختلف صوبوں میں ادیبوں کی انجمن قائم کرنا ان انجمنوں کے درمیان اجتماع ہوں اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعہ ربط وتعاون پیدا کرنا صوبوں کی، مرکز کی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان قریبی تعلق پیدا کرنا۔

(۲) ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

(۳) ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا جو صحت منداور توانا ہو جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

(۴) ہندوستان کوقومی زبان اوراندازرومن رسم الخط کوقومی رسم الخط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

(۵) فکرونظراوراظہارخیال کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا۔

(۶) ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جواپنی کتابیں طبع کرانے کے لئے امداد چاہتے ہوں۔ترقی پسند ادیبوں کے اس مینی فیسٹو پر ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر و ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے ایس بھٹ وڈاکٹر ایس سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے دستخط تھے۔

سجاد ظہیر اس دستور کوفوٹو اسٹیٹ کاپی کرا کر ہندوستان میں اپنے دوستوں کے پاس اس تاکید کے ساتھ روانہ کی کہ اس کی مزید کاپیاں کرا کر ہندوستان بھر کے ادیبوں کو بھیج کر ان کی رائے معلوم کریں اور خود سجاد ظہیر نے اپنے طور پر اپنے دوستوں مثلاً ڈاکٹر اشرف علی گڑھ۔ڈاکٹر محمد الفقراء مرشرن کی بیگم رشید جہاں پروفیسر ہیرن مکرجی کلکتہ احمد علی الہ باد وغیرہ کو خطوط لکھ کر دستور پر رائے مانگی ابھی رائے مشورہ جاری ہی تھا کہ سجاد ظہیر اپنی بیرسٹری کی تعلیم مکمل کر کے ۱۹۳۵ میں ہندوستان اپنے والد کے پاس الہ آباد آ گئے اور پھر ان کی کوششوں سے الہ آباد میں ترقی پسند ادیبوں کا ایک گروپ بن گیا۔جس میں الہ اباد یونیورسٹی کے انگریزی کے لکچرر احمد علی، فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، نریندر شرر، اور ایم اے کے دو ہونہار طالب علم، احتشام حسین اور سید وقار عظیم وغیرہ شامل تھے۔ان سب نے سجاد ظہیر کے منصوبے کو سراہا بلکہ پورا پورا تعاون بھی دیا۔پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی اور ڈاکٹر تاراچند نے بھی ہمت افزائی کی اور اس طرح الہ آباد اور اردو و ہندی ادیبوں کا ایک اور سنگم وجود میں آ گیا۔

اسی زمانے میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی طرف سے ایک کانفرنس ہوئی اس موقع سے بھی سجاد ظہیر نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس کانفرنس میں شریک ہونے والے۔منشی پریم چند و مولوی عبدالحق اور جوش ملیح آبادی کے سامنے اپنے منصوبے کو رکھتے ہوئے جب اسکا دستور دکھایا تو ان تینوں حضرات نے متفق ہو کر اپنے دستخط کر دیئے جس کا اعتراف خود سجاد ظہیر نے اس طرح کیا ہے۔

''ڈاکٹر تاراچند نے ہندوستانی اکیڈمی کی طرف سے اردو ہندی کے ادیبوں کی ایک کانفرس اس غرض سے منعقد کی تھی کہ اکاڈمی میں نئی جان ڈالی جائے۔ خیر اس میں جان کیا پڑتی، لیکن ادیبوں کا ایک جگہ جمع ہونا اچھی بات تھی۔ بہر حال یہ کانفرنس ہمارے لئے ان سے ملنے اور تبادلۂ خیال کا ایک اچھا موقع تھا'' [۱]

اس طرح الہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل کے بعد ملک کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں ترقی پسند رجحان رکھنے والوں نے اپنی انجمن قائم کرنا شروع کردیں۔ اس میں دوسری زبانوں کے ادبا بھی پیش پیش تھے اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسی کانفرنس بلائی جائے جس میں ملک میں بکھرے سارے ادیب اکھٹا ہوکر تبادلہ خیال کریں اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کریں۔ جیسا کہ سجاد ظہیر خود رقمطراز ہیں۔

''انجمن ترقی پسند ادبی تحریک کا رخ ملک کے عوام کی جانب مزدوروں کسانوں اور درمیانہ طبقے کی مخالفت کرنا اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حرکت، جوش، عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور تمام ان آثار ورجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود ورجعت، پست ہمتی پیدا کرتے ہیں ہمارا اولین فرض ٹھہرا۔ اس سے پھر دوسری بات نکلتی ہے وہ یہ تھی کہ یہ سب اسی صورت میں ممکن تھا جب ہم شعوری طور پر اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد اور وطن کے عوام کی اپنی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصہ لیں صرف دور کے تماشائی نہ ہو بلکہ حتی المقدور اپنی صلاحیتوں کے مطابق آزادی کی فوج کے سپاہی بنیں۔ اسکے یہ معنی کہ ادیب لازمی طور پر سیاسی کارکن بنیں لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ وہ سیاست سے کنارہ کش بھی نہیں ہوسکتے ترقی پسند ادیب کے دل میں نوع انسانی سے انس اور گہری ہمدردی ہونا ضروری ہے۔ بغیر آزادی خود ہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ممکن نہیں اسی وجہ سے ہم اعلانیہ اور دانستہ طور پر

ترقی پسند تحریک کا رشتہ ملک کی آزادی اور جمہوریت سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ترقی پسند ادیب دانشور۔ مزدوروں غریبوں کسانوں اور مظلوموں سے ملیں۔ ان کی سیاسی و معاشرتی زندگی کا حصہ بنیں ان کے جلسے جلوسوں میں جائیں اور انہیں اپنے جلسے جلوسوں میں بلائیں اسی لئے ہم نے اپنی تنظیم میں اس پر زور دینا چاہتے ہیں کہ دانشوروں کے لئے ادبی تخلیق کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی سے قریب ہونا ضروری ہے بلکہ نیا ادب بغیر اس کے پیدا ہو ہی نہیں سکتا اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہماری شاخیں گوشہ نشیں علماء کی ٹولیاں نہ بن جائیں بلکہ ان میں حرکت بھی ہو اور ادیبوں کے جلسے میں دوسرے لوگ بھی آئیں۔ ادیبوں کی نگارشات پر کھلی بحثیں ہوں ادیب اور شاعر عام لوگوں سے ملتے جلتے رہیں ان میں پیوست رہیں ان سے سیکھیں اور سکھائیں انجمن ادیبوں کی انجمن ہوتے ہوئے اور ادبی تخلیق پر زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول فرماتے ہوئے بھی انجمن ترقی اردو پابندی ساہتیہ سمیلن نہ بن جائے۔ بلکہ ایک ایسا جاندار ادبی ادارہ ہو جس کا عوام سے براہ راست اور مستقل تعلق رہے''۔[1]

انجمن ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے مختصر عرصے میں وہ مقبولیت حاصل کی ملک میں ہر طرف سے اس کی تائید ہونے لگی۔ اس سے متاثر ہو کر ایک کل ہند کانفرنس کی تجویز پاس ہوئی۔ صدارت کے لئے سجاد ظہیر نے منشی پریم چند کو راضی کر لیا اس طرح یہ پہلی کانفرنس رفاہ عام ہال میں اپریل ۱۹۳۶ء میں ہوئی اردو کے صاحب طراز ادیب چودھری محمد علی رودولوی صدر چنے گئے۔ اس کانفریس میں، جسے پرکاش نراین میاں افتخار الدین حسرت موہانی، کملا دیوی چٹو پادھیائے یوسف علی مہر وغیرہ کے علاوہ ملک کے تقریباً ہر حصے کے ادیب شریک ہوئے۔

---

[1] سجاد ظہیر - روشنائی ۱۹۶۵ء ۹۰-۱۹۹۱ء

''ترقی پسند مصنفین کے لوگوں نے اس کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ'' ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات وفنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اوران کوعوام کے دکھ سکھ اور جدو جہد کا ترجمان بنا کر روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔ ہم ہندوستانی تمدن کی اصل قدروں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لئے زندگی کے جس شعبے میں ردعمل کے آثار پائیں گے انہیں افشاں کریں گے۔ ہم انجمن کے ذریعہ ہر ایسے جذبہ کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کی ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب وتمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک، افلاس سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔

''ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری وپستی کی طرف لے جاتے ہیں ہم ان تمام قوتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں نعروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں اور ترقی کا ذریعہ قبول کرتے ہیں''

انجمن کے مقاصد یہ ہونگے۔

(۱) تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کر کے اردو لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

(۲) ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند براجمان کے خلاف جدو جہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی خواہش کرنا۔

(۳) ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادی رآئے وازادی خیال کی حفاظت کرنا۔

پریم چند کا خطبہ:-

پریم چند نے کانفریس کے شرکاء کو خطاب کرتے ہوئے کہا

حضرات!

''یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے ہمارے سمیلنوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت پر بحث کی جاتی تھیں یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود ہے اس کا منشاء خیالات وجذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت اہم کام تھا جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کرے اس میں خیالات وجذبات ادا کرنے کی طاقت ہو کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کر کے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لئے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ہم زبان سے گزر کر اسکے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشا سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔ رہی زبان جس میں ابتداء باغ بہار اور بتال پچیسی کی تصنیف معراج کمال تھی۔ اب اس قابل بھی ہوگئی ہے کہ علم وحکمت کے مسائل بھی ادا کرے اور یہ جلسہ اس کھلی حقیقت کا اعتراف ہے۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیئے ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخیلات کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے طلسم باندھا کرتے تھے کہیں فسانۂ عجائب کی داستاں تھی کہیں بوستان خیال کی اور کہیں چند کا نتا شتوشی کی۔

ان داستانوں کا منشاء محض دل بہلانا تھا اور ہمارے جذبہ حیرت کی تسکین لٹریچر سے زندگی کا کوئی تعلق ہے اس میں کوئی کلام ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ مسلم تھا قصہ قصہ ہے، زندگی زندگی، دونون متضاد چیزیں سمجھی جاتی تھیں شعراء پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا۔ عشق کا معیار نفس پروری تھا۔ اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انہیں جیسی جذبات کے اظہار میں شعراء اپنی جولانی وجدت کے معجزے دکھاتے شعر میں کسی نئی بندش نئی تشبیہ یا نئی پرواز داد پانے کے لئے کافی تھا۔ چاہے حقیقت سے کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو۔

لیکن انسان کی زندگی محض جنس نہیں ہے۔ کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات اور ان سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدرد ہو یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو ہماری ذہنی وجسمانی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے۔ جنسیت انسان کا ایک جزو ہے اور جس ادب کا پیشتر حصہ اسی کے متعلق ہو وہ اس قوم اور اس زمانے کے لئے فخر کا باعث نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے مذاق صحیح کی شہادت دے سکتا ہے۔

جب ادب پر دنیا کی بے ثباتی غالب ہو اور ایک ایک لفظ یاس وشکوۂ روزگار اور معاشقہ میں ڈوبا ہوا ہو تو سمجھ لیجئے کہ قوم جمود وانتشار کا شکار ہو چکی ہے۔ اور اس میں سعی واجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اس نے درجات عالیہ سے آنکھیں بند کرلی ہیں اور مشاہدے کی قوت باقی نہیں۔

مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان پر تولتا ہوں۔ بیشک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی بھی۔ لیکن ایسی کوئی روحانی ذوق اور معنوی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شئ ہے اور ایک ہی چیز سے ہمیں افادیت کے

اعتبار سے مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور غم بھی آسمان پر چھائی شفق بے شک ایک خوشنما نظارا ہے لیکن اگر اساڑھ میں آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ خوشی کا باعث نہی ہوسکتی کیوں کی وہ اکال کی خبر دیتی ہے''

اپنے طویل خطبے میں آگے فرماتے ہیں کہ

''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔ابھی تک اس کا معیار اسیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا ٹسٹ امراء کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔انھیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھیں کی خوشیوں اور رنجوں، حسرتوں اور تمناؤں، چشمکوں اور رقابتوں کی تشریح ونفیس آرٹ کا مقصد تھا اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں جھونپڑے اور کھنڈر اس کے التفات کے قابل نہ تھے انھیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا آرٹ نام تھا محدود صورت پرستی کا الفاظ کی ترکیبوں کا، خیالات کی بندشوں کا، زندگی کا کوئی آئیڈیل نہیں، زندگی کا کوئی اونچا مقصد نہیں''

پریم چند نے اپنے خطبے کا اختتام ان الفاظ کے ساتھ کیا کہ

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہوں، آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کر کے سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی'' [1]

کانفرنس کے آخری اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے اپنی تقریر میں ترقی پسند تحریک اور اس کے اعلانیہ سے پورا اتفاق کرتے ہوئے فرمایا:

''ہمارے ادب کی قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہئے۔اسے ساحرادیبوں اور ظلم کرنے والے امیروں کی مخالفت کرنی چاہیئے۔اسے مزدوروں،

---

[1] ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی - نیا ادب جنوری ۱۹۴۱ء اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۴۳

کسانوں اور تمام مظلوم انسانوں کی طرف داری اور حمایت کرنی چاہئے اس میں عوام کے دکھ سکھ ان کی بہترین خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار اس طرح کرنا چاہیئے جس سے ان کی انقلابی قوت میں اضافہ ہو اور وہ متحد و منتظم ہو کر اپنی جدو جہد کو کامیاب بنا سکیں''

مولانا نے اس تقریر میں اشتراکیت کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''محض ترقی پسندی کافی نہیں جدید ادب کو شوشلزم اور کمیونزم کی بھی تائید کرنی چاہیئے۔ اسے انقلابی ہونا چاہئے اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام کا جمہوری نظام اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں چونکہ موجودہ دور میں زندگی کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے اس لئے ترقی پسند ادیبوں کو انھیں خیالات کی ترویج کرنی چاہیئے'' [1]

مولانا کی تقریر کے بعد تحریک دستور اساسی پیش کیا گیا جو متفقہ طور پر منظور ہوا اور اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا۔ سکریٹری ہونے کے بعد سجاد ظہیر ملک کے مختلف دوروں کے سلسلے میں امرتسر گئے وہاں محمود الظفر کی مدد کی اور وہیں پہلی بار فیض احمد فیض سے ملاقات ہوئی اور پھر فیض کی رہنمائی میں لاہور جا کر مختلف ادیبوں سے ملے وہ ڈاکٹر اشرف کے ساتھ لاہور میں علامہ اقبال سے ملے اور ان کے سامنے تحریک کے مقاصد رکھے۔ انھوں نے حوصلہ دلایا اور بتایا کہ

''تاثیر نے مجھ سے تحریک کے بارے میں دو بار باتیں کی تھیں اور مجھے اس سے بڑی دلچسپی ہوئی۔ ممکن ہے شوشلزم کے سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو بات یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق کافی پڑھا نہیں ہے۔ میں نے تاثیر سے کہا تھا کہ مجھے اس موضوع پر

---

[1] سجاد ظہیر - روشنائی ص ۱۱۲

مستند کتابیں دیں۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ لیکن ابھی تک پورا نہیں کیا۔ میرا نقطۂ نظر آپ جانتے ہیں۔ ظاہر ہے مجھے ترقی پسند ادب اور شوشلزم کی تحریک سے ہمدردی ہے آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیئے''

غرض اس طرح اس تحریک نے ملک کے گوشے گوشے میں اپنے پر پرزے نکالے اور دیکھتے ہی دیکھتے گجرات، مسیور، مالا بار، بنگال، بہار، دہلی پنجاب وغیرہ میں انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں، گجراتی، کنٹر، تیلگو اور بنگالی پنجابی زبان کے ادیبوں نے بھی اس تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور اپنی اپنی زبانوں میں انجمن قائم کیں۔

ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد میں ایک کانفرنس ۱۹۳۷ء میں بلائی جس میں پنڈت رام نریش ترپاٹھی نریندر دیو اور مولوی عبدالحق کے نام صدارت کے لئے تجویز کئے گئے۔ جس میں نریندر دیو اور رام نریس ترپاٹھی نے ترقی پسند ادب کی پرزور وکالت کی۔ مولوی عبدالحق کسی وجہ سے نہ آسکے انھوں نے اپنا خطبہ صدارت لکھ کر بھیجا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ

''ہمارے اصول وعقائد ہمارے خیالات کیسے ہی پاکیزہ کیوں نہ ہوں اور خواہ ہمیں کتنے ہی عزیز کیوں نہ ہوں اگر زمانے کے عام فضا کے مطابق ان میں جدت اور تازگی پیدا نہیں کی جائے گی تو ایک روز بند پانی کی طرح اس میں سڑاند پیدا ہونے لگے گی اور اس میں ایسے زہریلے جراثیم پیدا ہو جائیں گے جو ان کی ہلاکت کے باعث ہوں گے۔ بندریا کو اپنے بچے سے بڑی محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ بچہ جب مر جاتا ہے اور اس کا ایک ایک عضو سڑ کر گرنے لگتا ہے یہی حال افراد اور قوم کی زندگی کے ہر شعبے کا ہوتا ہے جب لوگ اپنے مرغوب رسم ورواج اور توہمات کو سینے سے چمٹائے پھرتے ہیں وہ تو خیر زمانے کی دست برد سے گل سڑ کر گر ہی جاتے ہیں مگر وہ خود بھی اسی کے ساتھ فنا ہو جاتے ہیں''

مولوی صاحب نے اپنے آخری خطبہ میں کہا کہ

''آپ کا کام اس وقت وہی ہے جو اٹھارہویں صدی میں انسائیکلو پیڈیست نے فرانس میں کیا تھا انھوں نے رجعت پسندی کے ہاتھوں کیسی کیسی سختیاں جھیلیں قید میں رہے، جلاوطن کئے گئے، کتاب چھپنے کی ممانعت کر دی گئی یہ سب سہا مگر عزم سے نہ پھرے وہ صرف چند نقوش تھے مگر دھنو کے پکے اور عقیدے کے سچے تھے ان کی زندگی کا مطالعہ کیجئے ان کے کاموں کو دیکھئے اور ان کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کیجئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ کامیاب نہ ہوں'' [1]

ہندوستان سے ہر طبقے کے ادیبوں، دانشوروں اور سیاستدانوں کی تائید نے ترقی پسند ادیبوں کے حوصلے کو بہت بڑھاوا دیا۔ اور انھوں نے پھر الہ آباد میں ۱۹۳۸ء میں ایک بڑی کانفرنس بلانے کی ٹھانی۔ اس میں ہندوستان کے تمام ادیب اور شاعر اکٹھا ہوئے۔ جواہر لال نہرو نے تقریر کی اور ہندوستان کے مشہور رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک پیغام بھیجا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی لمبی تقریر کا خلاصہ کرتے ہوئے کہا کہ

''آرٹسٹ اور ادیب میں انفرادیت ہوتی ہے اگر کسی آرٹسٹ میں انفرادیت نہیں تو اس کو آرٹسٹ نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر اس کی انفرادیت ایسی ہے کہ وہ سماج سے الگ ہے اور جو چیزیں سماج کو ملاتی ہیں ان میں متاثر نہیں ہوتا تو وہ ادیب بیکار ہے۔ اس کی اکیلی طاقت سماج کو آگے نہیں پہنچا سکتی لیکن اگر اس کے برخلاف اس کی انفرادیت میں سماج کو دخل ہے یعنی وہ انفرادیت سماج کا نمائندہ کہی جا سکتی ہے تو بڑی چیز ہے اس میں قوم کی طاقت آ جاتی ہے اور وہ دنیا کو ہلا دیتی ہے گزشتہ دور میں جتنے بھی لکھنے والے ہوئے شکسپیر وغیرہ وہ سب کسی نہ کسی طرح اپنے سماج کے نمائندہ تھے اور اگر انفرادیت

---

[1] نیا ادب جنوری فروری ۱۹۴۱ء

ترقی پاسکتی ہے تو وہ صرف شوشلزمی سماج میں ۔ یہ کہنا کہ شوسلزم آ کر انفرادیت کو ختم کردے گا غلط ہے ۔ وہ دور ایسا نہیں ہوگا کہ سب ایک ہو جائیں بلکہ ہر ایک کو اپنے ڈھنگ پر ترقی کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے'' [۱]

لیکن افسوس پہاڑی دریا کی طرح جس تیزی اور گھن گرج کے ساتھ یہ تحریک ابھری اور اسی تیزی کے ساتھ روبہ زوال بھی ہوئی صرف بیس سال کے عرصہ میں اس کی ابتدا انتہاء میں بدل گئی ۔ ابھی تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ اس تحریک سے وابستہ عام شعراء کے ذریعہ جس قسم کے رجحانات سامنے آئے اس سے تحریک کی ادبی ساکھ کو زبردست دھکا لگا اور اس کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا ۔ ایسی ایسی نظمیں سامنے آنے لگیں جس میں مار دھاڑ ، گولہ بارود لوٹ مار کی لایعنی گرج سنائی دینے لگی ۔ نہ اس سے ملا کا عمامہ بچ سکا نہ پنڈت کی پگڑی ۔ اس طرح کے رجحانات اور نعروں کو دیکھتے ہوئے جواہر لال کو تحریک کے ادیبوں کو مشورہ دینا پڑا کہ

''ایک بات سے میں جھجکتا ہوں'' وہ یہ کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے خاص خاص نعرے دوہرانے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ زبردست خیال رکھتے ہیں ۔ یہ زیبا نہیں نہ اس میں آرٹ ہے نہ کوئی خاص پیغام ۔ ایسی چیزوں کی جگہ سیاست میں ہے ادب میں نہیں'' [۲]

اس سلسلے میں صرف جوش ملیح آبادی کی نظموں کو دیکھیے اس سے ہمیں دیگر شعراء کے رجحانات کا اندازہ ہو جائے گا یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ سجاد ظہر نے جرمنی میں ہٹلر کے مظالم اس کی فاشزم اور لندن میں جرمنی کے مہاجروں کی حالت زار سے متاثر ہو کر ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالتے ہیں اور اگر پھر انھیں کے گروپ کا ایک قائد ہٹلر کو سلام کرنے لگے تو کون ہے جو اس تضاد پر اپنا سر نہ پیٹ لے گا

---

[۱] نیا ادب جنوری ۱۹۴۱ء

[۲] خلیل الرحمٰن اعظمی ۔ اردو میں ترقی پسند تحریک ص ۳۳۶

جوش نے کس طمطراق اور طنطنے سے یہ نظم کہی۔شروع یوں کرتے ہیں

ے سلام اے تاجدار جرمنی اے ہٹلر اعظم
فدائے قوم شیدائے وطن اے تیراء عالم
خبر لینے یکنگھم کی جواب کی بارتم جانا
تو میرے نام سے بھی ایک گولہ پھینکتے آنا

ان کی نظم شکست زنداں کے شعر بھی دیکھئے

ے کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
پھرکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ڈھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

نظم بغاوت کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں

ے ہاں بغاوت آگ بجلی، موت آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل میرے جلو میں قتل عام
آندھیوں سے میری اڑ جاتا ہے دنیا کا نظام
رحم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام
موت ہے خوراک میری موت پر جیتا ہوں میں
سیر ہو کر گوشت کھاتی ہوں لہو پیتی ہوں میں

یہ ایک پاگل درندے کی تصویر کشی نہیں ہے اگر انقلاب اس قدر مہلک بھیانک اور تباہ کن ہے تو کوئی اس کا استعمال کیوں کرے اور جب ایسا نہیں ہوا تو مایوسی نے انھیں وہاں پہنچا دیا کہ وہ ہندوستانی عوام کو ہی بزدل اور نامرد کہنے پر آمادہ ہو گئے۔

اے ہندے کے ذیل غلامان رو سیاہ

شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لئے نگاہ

ان بزدلوں کے حسن پر شیدا کیا تھا کیوں

نامرد قوم میں تجھے پیدا کیا تھا کیوں

یہ انداز بیاں تو اس شاعر کا ہے جسے قوم نے شاعر انقلاب کے خطاب سے نوازا تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اور شاعروں ادیبوں کا کیا حال ہوگا اگر ان کے افسانے نظمیں اور غزلوں کے مواد تھوڑے تھوڑے اکٹھا کئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی ۔ ۱۹۵۹ء میں یہ تحریک دم توڑ گئی ۔ پوری تحریک گمراہ ہوئی اور بالآخر اپنے داخلی تضاد کے باعث ختم ہوگئی ۔

اگر سختی کے ساتھ ترقی پسند ادب کا جائزہ لیا جائے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ۱۹۳۹ء سے لے کر آج تک ۱۹۵۳ء اردو میں صرف تین یا چار ایسی عوامی نظمیں لکھی گئی ہیں جن کو قبول عام کی سند حاصل ہے ۔ مثلاً مخدوم کی نظم ''جنگ آزادی'' ''مرا گیت'' ''بھوکا بنگال'' اور عمر شیخ کا ''نیا ترانہ'' عوامی تحریک کے سلسلے میں ان نظموں نے جادو کا کام کیا ہے مگر اب تحریک کو متحد بادوں کی ضرورت ہے ۔ [1]

ان سب مختلف وجوہات کی بناء پر یہ تحریک بہت جلد قصہ ماضی بن گئی ۔

---

[1] واثق جونپوری - واثق شاعری شاہراہ جولائی ۱۹۵۲ء

باب چہارم

وامق کی نظمیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ

وامق کی نظمیہ شاعری کا تنقیدی جائزہ

وامق کی پیدائش ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی ان کا بچپن اور جوانی پوری طرح جاگیردارانہ ماحول میں گزری جہاں تربیت کے نام پر بچوں کو عوام الناس خصوصاً غریبوں ناداروں اور کم پڑھے لکھے لوگوں سے خلط ملط اس لئے گناہ سمجھا جاتا کہ ان کی زبان خراب ہو جائے گی ان کی عادتیں خراب ہوں گی اور ان کے فہم ادراک وشعور زنگ آلود ہو جائیں گے۔ جاگیردارانہ نظام میں بچوں کی تعلیم وتربیت ایک خاص ماحول میں ہوئی تھی ان کے لئے عام مکتبوں اور مدرسوں سے الگ گھر پر اچھے اور قابل اساتذہ کے ذریعہ تعلیم کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اور حویلیوں میں ان کی ایک ایک حرکات وسکنات پر نگاہ رکھی جاتی تھی وامق کے والد سید محمد مصطفیٰ اپنے زمانے کے گریجویٹ (بی، اے) تھے سرکاری ملازم تھے ترقی کرتے کرتے آئی۔سی۔ایس گریڈ تک پہنچ کر ڈپٹی کلکٹر ہو گئے اور کلکٹری ہی کے دور میں ریٹائر ہوئے۔ ظاہر ہے ان علمی وادبی، زمیدارانہ وجاگیردارانہ خصوصیات وروایات کے ہوتے ہوئے وامق کے والدین نے وامق کو اپنے روایتی اقدار میں ڈھالنے کے لئے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔

مگر وامق کے واقعات وحالات، بود باش، ان کا فن، ان کی شاعری، ان کی زبان، علی الاعلان اس بات کی غماز ہیں کہ وامق نے جاگیردارانہ نظام کو ایک لعنت کے طور پر جھیلا۔ اسے کبھی اچھا نہیں سمجھا اور ایک دردمند اور عقلمند انسان اس نظام کو اچھا سمجھ بھی کیسے سکتا ہے۔ جہاں زمیندار اور جاگیردار کا سب کچھ تھا اور اس کی رعایا کا کچھ بھی نہ تھا یہاں تک کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں آ سکتا تھا نہ جا سکتا تھا نہ غمی میں اپنی مرضی سے رو سکتا تھا اور نہ شادی میں گا سکتا تھا اپنی مرضی سے جینے کا ایک دن بھی اسے اختیار نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وامق کی شاعری خواہ وہ نظم ہو یا غزل ہو یا نثر ہو اس کے ایک ایک حرف سے اس نظام کے خلاف بغاوت کی جھلک ملتی ہے اور وامق نے اپنی تخلیقات میں جو زبان

استعمال کی ہے اسے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ شخص ایک جاگیردارانہ نظام کا پروردہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وامق ہوش آنے کے ساتھ ساتھ اس نظام میں جکڑے ہوئے اپنے ایک ایک بند کو توڑتے گئے ہیں انھوں نے خود اپنے خاندانی ماحول پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا کہ

ایسی باتیں مثلاً شیخی، بڑی بڑی باتیں کر کے جتنا میں ہیں اس سے زیادہ اپنے کو ظاہر کرنا یہ کچھ یہاں کا ماحول تھا''

اور پھر اس کی وجہ بھی خود ہی بتاتے ہیں کہ

''وہ یہ نہ کرتے تو دوسرے ان کو ختم کر دیتے کیونکہ تصادم سامنتی نظام میں چلتا رہتا تھا جو جتنا ہوتا نہیں تھا اتنا ظاہر کرتا۔ ایک بہت نفسیاتی بات ہے کتا جو بھونکتا ہے وہ خود ڈرتا ہے ٹھیک وہی سائیکالوجی آدمی میں بھی کام کرتی ہے جب وہ بڑی بڑی باتیں کرتا ہے تو وہ اس لئے نہیں کہ وہ اپنے کو بڑا سمجھتا ہے بلکہ اس لئے کہ اس طرح دوسرے اس کو بڑا سمجھیں۔ یہ سب چیزیں اور چھوٹا بڑا ہونا سرکاری نوکریوں کے اعزاز وغیرہ۔ گھر کے یہ حالات مجھے بچپن سے ہی ناپسند تھے'' [1]

وامق نے دو عظیم جنگوں کے درمیان ہوش سنبھالا۔ سچ تو یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی سے ہندوستانی انقلاب کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ عوام سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ اور جاگیردارانہ نظام میں گھٹن محسوس کرنے لگے تھے اور اس کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی تھیں ہندوستانیوں کے جذبۂ آزادی کو انگریزوں نے جتنا دبانا چاہا اتنا ہی وہ پروان چڑھتا گیا ۱۹۱۹ء میں جلیان والہ باغ میں آزادی کے نہتے متوالوں پر انگریزوں نے جو قہر ڈھایا اس نے ہندوستانیوں کو دہلا کر رکھ دیا۔ اور ہمیشہ کے لئے یہ حادثہ ہندوستانیوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا بیج بو گیا۔ پھر ۱۹۴۴ء ہندوستان چھوڑو تحریک کو دبانے کے لئے انگریزوں نے ہر ظلم و جبر کو اپنی پرانی عادت کے مطابق جائز سمجھا۔

---

[1] ایس۔ ایم عباس۔ شخص اور شاعر

جس نے ہندوستانیوں کو پھر جھنجھوڑ کر رکھ دیا سبھی لوگوں کے دلوں میں نفرت کی جوالا بھڑک اٹھی اور پورا ہندستان بلاتفریق مذہب وملت اس ظلم کے خلاف اور آزادی کے حق میں ایک آواز ہوگیا۔

دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء تقریباً چھ سال تک ملک پر اپنا قہر برساتی رہی کتنے ملکوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ نئے نئے ملک اور نئی نئی سرحدیں وجود میں آ گئیں سیاسی اتھل پتھل کے ساتھ ساتھ ساری پرانی قدریں پامال ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ نئے نئے اقتصادی معاشی ومعاشرتی مسائل ابھر کر سامنے آ رہے تھے جس کا مقابلہ کرنے اور اس کا حل ڈھونڈھنے کے لئے راستوں کی تلاش شروع کر دی۔ انقلاب روس کے ذریعہ جس طرح مساوات عدل وانصاف وخوشحالی کا پروپگنڈا کیا گیا اس کا اثر نوجوان نسلوں پر زیادہ ہوا۔ جنگ عظیم کے مضر اثرات سے سماج میں جو ابتری پیدا ہوئی اور اس سے ساری اخلاقی قدریں چرمرا کر رہ گئیں۔ اس سے ہر ادیب شاعر اور فنکار تڑپ کر رہ گیا۔ وہ اپنے احساسات اور مشاہدات کا گلا گھونٹ بھی نہیں سکتا تھا نتیجتاً ان امن کا پیغام دینے والوں نے انقلاب کا نعرہ دیا۔ اور سنگین حالات سے لڑنے کے لئے تمام حساس ادیب اور شاعر ترقی پسند تحریک کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے جس کے ہراول دستے میں وامق پیش پیش تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کے نعرہ انقلاب کے بارے میں احتشام حسین نے لکھا ہے

> ''انھوں نے انقلاب کی تمنا اس وقت کی جب حالات ناقابل اصلاح نظر آئے۔ انقلاب کی یہ خواہش تحریک کی وہ فطری خواہش ہے جس سے کوئی صحت مند دل خالی نہیں چنانچہ دوسری جنگ عظیم کی تباہیوں، بربادیوں اور ان کے اثر سے پیدا ہونے والی ذہنی کیفیتوں پر اظہار تشویش اور اظہار غم کے ساتھ ساتھ ادیبوں نے زندگی کے وہ پہلو بھی دیکھے جو تعمیر کے کام آ سکتے تھے۔ جنگ سے نفرت کا ظہار کرتے ہوئے ایک پائیدار امن کی تمنا کرتے ہوئے اردو شاعروں اور ادیبوں نے ان تمام قدروں سے وابستگی کا اعلان کیا جو ترقی امن اور انسانی پہلوؤں کی ترجمان تھیں۔

نہ صرف ترقی پسند بلکہ دوسرے ادیب وشاعر بھی ایسا محسوس کرتے رہے کہ جنگ نے دیرپا اثر چھوڑے ہیں خیالات میں ہیجان بپا کیا ہے غور وفکر کے طریقوں کو متاثر کیا ہے اس سے ادب کے موضوعات اور ہیئت میں تبدیلیاں ہوئیں ہیں اور ایسا ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں'' [۱]

ابھی ہندوستان جنگ کی تباہیوں سے تڑپ ہی رہا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوگیا، مگر اس پر مسرت اعلان کے ساتھ ساتھ ملک کی تقسیم جیسے سنگین مسئلے نے آزادی کی ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ ملک کی ناعاقبت اندیشانہ تقسیم پھر بنگال، پنجاب کی تقسیم جس سے لاکھوں انسان خود انسانوں کے ہاتھوں فرقہ پرستی کے شکار ہوئے لوگوں نے گھر چھوڑے، در چھوڑے، ملک چھوٹا، بھائی بند عزیز واقارب چھوٹے اور اس طرح یہ سب انجام پزیر ہوا کہ پوری انسانیت بلبلا اٹھی ایسے میں ترقی پسند تحریک اور اس کے ہراول دستے کا ایک سیاسی کیسے اچھوتا رہ سکتا تھا۔ وامق دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے پہلے ہی جاگیردارانہ وسرمایہ دارانہ نظام میں غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور عام لوگوں کے خلاف اپنی قلمی جہاد چھیڑ چکے تھے وہ بھلا ان سخت حالات میں کیسے خاموش رہ سکتا تھا وامق کی شاعری وکرب کے بارے میں احتشام حسین نے یوں تبصرہ کیا ہے

''یہ تو معلوم نہیں کہ وامق نے شاعری کب شروع کی لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی سالوں میں لوگوں کو اپنی شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ اس وقت اردو کے اکثر نوجوان شاعر ایک روحانی کرب میں مبتلا تھے نہ محبت میں کیف تھا نہ شراب میں مزہ، نہ آوارہ گردی میں لطف، نہ ملازمت اختیار کرنے میں سکون نہ سیاسی اداروں پر پورا پورا بھروسہ تھا، نہ راہ عمل کا ٹھیک ٹھیک یقین ہوا تھا .....انفرادی اور قومی آزادی کی خواہش تھی

---

[۱] احتشام حسین - جدید ادب ''منظر پس منظر''

سیاسی اداروں میں شریک ہو کر کام کرنے کی امنگ تھی عناصر فطرت پر قابو پانے کا حوصلہ تھا عوام کی جدو جہد میں شریک ہونے کا حوصلہ تھا'' [۱]

وقت کے بدلتے ہوئے تیور کا وامق نے بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا۔ جس سے ان کی ذہنی وابستگی غریب، مزدور، عوام اور محنت کش عوام کے ساتھ بڑھتی چلی گئی اور اس پر سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ پروفیسر مکھر جی، حسین ظہیر اور سجاد ظہیر کی صحبتوں نے پروفیسر ڈی۔ پی مکھر جی کی صحبت اور ان کی تعلیم و تربیت ان کے ذہنی شعور پر کتنا اثر ڈالا، خود وامق نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے

''ان کی قربت، ان کی صورت، ان کے مذاکرات، ان کی باتیں، ان کا اٹھنا بیٹھنا، ان کا رہن سہن سب سے ایک تحریک حاصل ہوتی تھی اس سے معلوم نہیں کتنے پرانے محل، میرے ذہن میں جو فرسودہ قسم کے تھے آرام طلب زندگی اور عالی شان مکانوں میں رہنے سے جو بنے تھے سب منہدم ہو گئے اور ذہن ایک دم صاف ہو گیا''

اس وقت اپنی ذہنی کیفیت کا تذکرہ انھوں نے یوں کیا ہے

''میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آیا انگریزوں سے وفاداری ٹھیک ہے اور زمینداری کو قائم رکھنا چاہیئے یا بغاوت کر کے اسے ختم کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے ذہن ناپختہ تھا۔ اردو تحریک آزادی میں حصہ لینے کا جذبہ تھا ادھر والدین سے اختلاف کا خیال زور پکڑتا تھا۔ عملی دور پر میں ادھر جانے کے لئے ..... میں ان کے قربت سے بہت متاثر ہوا اور آپ آج مجھے پا رہے ہیں۔ چاہے شعر کہنے کا جذبہ ہو، یا اٹھنے بیٹھنے کا میرا طریقہ یا میرے سوچنے کا طریقہ انھیں سے متاثر ہونے کے بعد، صحیح راستے کی ان سے تربیت پاتا رہا۔ اس سے مجھے زندگی میں پریشانیاں،

---

[۱] پیش لفظ ''جرس'' احتشام حسین ص ۶۲

یہاں تک کہ فاقے تک کی نوبت کا سامنا کرنا پڑا مگر میں پھر بھی بہت خوش ہوں،، [1]

ڈاکٹر حسین ظہیر کی وامق کو کتنی تحریک ملی خود وامق کے لفظوں میں

''یہ اس وقت کی بات ہے جب میں شعر کہنے لگا تھا اور آل انڈیا لکھنؤ سے میرا کلام نشر ہوا تھا ایک مشاعرے میں ڈاکٹر حسین ظہیر سے ملاقات ہوئی میں مشاعرے سے نکلا تو ڈاکٹر صاحب پورٹیکو میں میرا انتظام کر رہے تھے دیکھتے ہی بولے محبتیٰ یہاں آؤ تمھیں ہو نا وامق؟ اور اپنے ساتھ بڑی شفقت کے ساتھ گھر لے گئے کہنے لگے تمہیں دیکھا کرتا تھا آج میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور تمھاری شاعری پسند آئی''

سجاد ظہیر عرف بنے بھائی جو ترقی پسند تحریک کے بانی تھے وامق سے ان کے بڑے قریبی تعلقات تھے اور اسی قربت کا نتیجہ ہے کہ سجاد ظہیر کے نظریہ افکار و خیالات سے وامق کافی متاثر ہوئے جو ان کی شخصیت کو نکھارنے میں آگے چل کر بہت مددگار ثابت ہوئی بقول ایس۔ ایم عباس کے

''اس طرح یہ وہ چند مخصوص شخصیتیں ہیں جن سے زمانہ طالب علمی ہی میں وامق کافی متاثر ہوئے ان شخصیتوں نے وامق کے شعور کو نکھارا ان کے فن اور زندگی کو ایک نیا آہنگ عطا کیا اور شخصیتیں اور ان کی شخصیت کی نشو نما میں معاون ہوئیں'' [2]

انھیں قد آور شخصیات سے متاثر ہو کر تحریک ترقی پسند میں شامل ہوئے اور آخری سال تک اس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ وامقؔ نہ صرف ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئے بلکہ شعراء و ادباء کا جو ایک عظیم گروہ سرمایا دارانہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اس میں وہ پیش پیش تھے اور کشمکش حیات کے اس دور میں خود وامق کے احساسات و خیالات کے بارے میں خود انھیں کی زبانی معلوم ہوئے ہیں

---

[1] ایس۔ ایم عباس ''شخص اور شاعر'' ص ۳۰-۳۱

[2] ایس۔ ایم عباس ''وامق شخص اور شاعر'' ص ۳۶

T- 5963

''وامق کے لفظوں میں ملک کے بیشتر حساس اور ذہین شعراء وفنکار کی طرح ان کا اپنا خیال بھی ''سیاہ ماضی'' کا ایک سلسلہ تھا۔ جہاں کوئی خوشی نہیں تھی ۔زندگی کرب واضطراب کے ایک بڑے سمندر میں غوطہ زن تھی لیکن وہ جو حال پر پڑی دھند کی دبیز چادر چاک کر کے دور افق کے اسے دیکھنے کا حوصلہ رکھتے تھے وہ دور کہیں انقلاب کی آہٹیں بھی سن رہے تھے یہ لوگ دنیا کو نئے انقلاب کی بشارت بھی دے رہے تھے''

وامق کی نظم ''کون ہنسا'' کے مطالعے سے اس وقت کے ماحول اور حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابھی تو آگ کا طوفاں ہے تند آہوں میں
ابھی تو مشعلیں خاموش ہیں نگاہوں میں
ابھی تو خاک سر میں شگو فہائے چمن
ابھی تو کھیتوں میں چلتی ہے پھوک کی آندھی
ابھی تو بھٹیوں میں اور چاہئے، ایندھن
ابھی تو دیر و حرم کے رنگ زرد اور سبز
ابھی تو اپنا گریباں ہے اور اپنا ہی ہاتھ
یہ تو پھر کون ہنسا کیوں ہنسا، عجیب سی بات
ہمارے کان ہنسی کے نہیں ابھی عادی
ابھی تو صرف اٹھا کرتی ہے مہیب صدا

اسی فضا سے اسی بے کراں سمندر سے
یہ چھوٹے چھوٹے تغیر یہ اوچھے اوچھے وار

بتا رہی ہیں یہ بے چین کروٹیں اے دوست

کہ جلد ایک بڑا انقلاب آئے گا''[1]

واقعی دنیا نے دیکھا کہ اس الہامی شاعر کے بقول وہ انقلاب آیا اور اس انداز سے آیا کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی وامق ادب برائے زندگی کے قائل تھے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ادیب یا شاعر وہ زندگی کے ہر نشیب وفراز کا گہرائی سے مشاہدہ کرے اپنی سوسائٹی اور سماج اور معاشرہ کو بھی بھانت برتے اور سمجھے اور عوام کے ہر مسائل سے قریب سے قریب تر ہو تبھی جا کر وہ اپنے تخلیقی عمل کے لئے ایک پر اثر مواد فراہم کر سکتا ہے وامق نے اس راز کو بخوبی سمجھ لیا تھا اس لئے انھوں نے ماضی کی تمام انانیت پسند روایت سے بغاوت کی۔ بقول سید محمود الحسن کے

''وامق نے جاگیردارانہ نظام میں آنکھ کھولی ان کے والد انگریزی حکومت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، جن کو عیش وعشرت کے ساتھ مشرقی روایات اور خاندانی قدروں کا احساس بھی تھا تعلیم کی اہمیت کے قائل تھے بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے لیکن یہ تصور ضرور تھا کہ تعلیم وتربیت میں اس میعار کو سامنے رکھا جائے جو امراء ورؤسا کے لئے مناسب ہوتا ہے اور جس سے خاندانی وقار یا ماضی کی عظمت سے انحراف نہ ہو۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے بڑے بیٹے احمد مجتبیٰ (وامقؔ) کو ان روایات کے مطابق نہ بنا سکے جن کی ان سے توقعات تھیں۔ شروع ہی سے ان کی فطرت باغیانہ رجحانات کا احساس دلاتی رہی جو عمر کے ساتھ ساتھ قوی سے قوی تر ہوتا گیا۔ گھریلو اور خاندانی پابندیاں یہ تھیں کہ وہ عام لڑکوں یا معاشی حیثیت سے کمزور طالب علموں کو اپنے سے دور رکھیں۔ لیکن وہ انھیں سے ملنا جلنا اور انھیں کے ساتھ کھیلنا پسند کرتے تھے غریبوں اور کسانوں سے ہمدردی تھی ان کی قربت سے نفرت کے بجائے

---

[1] وامق کی نظم۔ کون ہنسا

دلچسپی تھی اور اس فطری رجحان اور باغیانہ ذہن کے اثرات تھے جس کے نتیجے میں قدیم روایتی شاعر اور فنی تقاضوں سے بھی انحراف کیا'' [۱]

اور یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ کوئی ادیب وشاعر عوام کی زبان میں عوام کے لئے اس کے جذبات کی ترجمانی اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک وہ عوام الناس میں گھل مل کر ان کے شب وروز کے مسائل کا اندازہ نہ کرے یہی وجہ ہے کہ مزدور اور کسانوں، مجبوروں، دہقانوں پر لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا مگر وہ عوامی شاعری یا ادب کا درجہ نہ حاصل ہوا کیونکہ ان کی زبان اتنی گاڑھی اور ادق تھی کہ عوام تو عوام خواص بھی لغت دیکھنے پر مجبور ہوتے تھے اور آج تو یہ حال ہے کہ جوشؔ کی نظم کسان جو کسان پر ہے (کسان کے لئے نہیں) جس استاد از زبان میں لکھی گئی ہے آج کے استاد بھی بہ مشکل اس کی صحیح قرأت کر پائیں گے اس کے برعکس نظیر اکبرآبادی نے اس وقت عوامی ڈگری پر قدم رکھا جب اٹھارہویں صدی میں میرؔ، دردؔ، سوداؔ اور شیفتہ جیسے استاد کا دنیاء شعروسخن میں طوطی بول رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس وقت نظیر کے کلام کو کریہہ اور سوقیانہ کہہ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن بعد میں وہی نظیر ہندوستانی سماج میں اردو کا پہلا عوامی شاعر بن گیا۔ اور اس کی نظموں میں بنجارہ، تلاش زر، مفلسی، رومئ نامہ، پھولی وغیرہ سے ہندوستان کے قصبے اور دیہات گونجنے لگے عوامی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے عوام وخواص سبھی بخوبی سمجھ کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ برخلاف اس کے جس ادب کو زبان اور فن کے لحاظ سے معیاری قرار دیا جاتا ہے اسے خواص تو بھلے ہی سمجھ کر اپنی خلوتوں میں لطف اندوز ہوں مگر عوام کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔

دوسری بات یہ کہ چونکہ عوامی ادب روایتی نہیں بلکہ خالص تجربات ومشاہدات پر ہوتا ہے اس پر اخلاص کا رنگ غالب رہتا ہے اور وہی اخلاص ہے جو قاری وسامع کے دل ودماغ پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہر شخصی شاعر ادیب کی کیفیات کو اپنی سرگذشت سمجھتا ہے۔

---

[۱] پروفیسر محمود الحسن - نیا دور جون ۱۹۹۹ء ص ۹

وامق کے شروع شروع کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اسی روایتی ادب سے متاثر تھے جو میر و غالب سے جگر تک پہونچی تھی دیکھئے ان کی اس وقت کی شاعری کے نمونے۔

ایک خواب ایسا بدن لپٹا ہوا پھولوں میں
بار صد رنگ اٹھائے ہوئے ڈالی کی لچک
ایک گلزار تصور ہے بہت بترے لئے
اے جنوں اور بہک اور بہک
شباب اس کا چھلکتی شراب کا ساگر
خطاب اس کا پھوار و آبشار کا جیسے
ان انکھڑیوں کو چومتی ہے یوں میری نظر
منڈلائے جس طرح کوئی بھونرا کنول کے بیچ
تارے گندھے ہوئے ہیں کہ دلہائے عاشقاں
کیسی چمک دمک ہے یہ زلفوں کے بل کے بیچ
جو دور سے اسے دیکھو تو چاند جیسا لگے
قریب جاؤ تو پتھر دکھائی دیتا ہے
دل کے ویرانے کو یوں آباد کر لیتے ہیں ہم
کر بھی کیا سکتے ہیں تجھکو یاد کر لیتے ہیں ہم
وعدہ خلافی کر کے صفائی نہ دیجیئے
اس شرط پر ہمیں شب ہجراں قبول ہے [1]

ابھی وہ اسی طرح کی روایاتی شاعری میں الجھے ہوئے تھے کہ اپنے مخلص دوستوں کی بدولت

---

[1] وامق جونپوری

(جن کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے) ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو اپنی سابقہ غلطی کو محسوس کر کے توبہ کر لی اور پوری خود اعتمادی سے اپنے ادبی سفر کی راہیں متعین کیں اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنی راہ پر آگے بڑھتے گئے جس نے آگے چل کر ادبی حلقوں میں وامقؔ کو ایک ترقی پسند اور عوامی شاعر بھی شاعر جمہوری کی حیثیت سے متعارف کرایا پھر تو انہوں نے اپنے کلام خاص کر نظموں کے ذریعہ ہر حلقے میں اپنی جگہ بنائی۔

وامق جن دنوں پوری دلجمعی اور خلوص کے ساتھ ترقی پسند تحریک میں اپنے دیگر ہمنواؤں کے ساتھ گامزن تھے انہیں دنوں غالباً ۱۹۴۲ء میں بنگال میں زبردست قحط پڑا دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی انگریزوں نے اپنے سامراج کو بچانے کے لئے پوری طاقت جھونک دی تھی۔ کپڑے، غلے اور دیگر ضروری اشیاء پر کنٹرول کر دیا گیا۔ جسے ہندوستانی عوام پہلی بار لفظ کنٹرول سے آشنا ہوئے۔ اس کنٹرول کی آڑ میں بنگال کے ساہوکاروں اور جاگیرداروں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اناج اور ضروری اشیاء سے اپنے گوداموں کو بھر کر قحط کی سنگینی کو سنگین تر کر دیا۔ جس سے بھوک مری عام ہوگئی ہر طرف افراتفری کا عالم پیدا ہوا۔ پوری انسانیت کراہ اٹھی۔ حساس اور باضمیر انسانوں کا قافلہ بنگال کی طرف دوڑ پڑا اور وہاں جا کر ساہوکاروں اور مہاجنوں کی بیدردی اور انسانیت سوزی کا خود مشاہدہ کیا۔ اسی سے متاثر ہو کر کرشنن چندر نے اپنا مشہور افسانہ ''ان داتا،، لکھا۔ وامقؔ بھی اس قحط کی بربادی اور تباہی کو دیکھنے خود بنگال گئے۔ وہاں کی بربادی، عوام کی زبوں حالی اور خون آشام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر انتہائی متاثر ہوئے واپسی میں آتے آتے ان کی مشہور نظم'' بھوکھا بنگال'' عوام کے سامنے تھی۔ بھوکھا بنگال کی بے پناہ عوامی مقبولیت کا ذکر سجاد ظہیر نے ''روشنائی،، میں لکھا ہے کہ یہ نظم تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ نظم کے ایک ایک لفظ سے قلبی اضطراب اور درد کا احساس قاری کو ہوتا ہے زبان پوربی بولی کی ہے جسے بنگال، بہار پوربی اتر پردیش کے لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ بنگال بھوجپوری اور پوربی ہم مشابہ ہیں۔ پھر وامق کا اپنا طرز بیاں ہے جس نے نظم کے ایک

ایک لفظ کو درد کا پیکر بنا دیا ہے ملاحظہ ہو۔

پورب دیس میں ڈگی باجی پھیلا سکھ کا کال
جن ہاتھوں نے موتی روولے آج وہی کنگال
اے ساتھی آج وہی کنگال
اے ساتھی بھوکا ہے بنگال
ندی نالے گلی ڈگر پر لاشوں کے انبار
جان کی ایسی مہنگی شے کا الٹ گیا بیوپار
مٹھی بھر چاول سے بڑھکر سستا ہے یہ مال
اے ساتھی سستا ہے یہ مال
بھوکھا ہے بنگال
اے ساتھی بھوکھا ہے بنگال

حالات کی منظر کشی کا یہ کتنا حسین دلکش اسلوب ہے۔لفظوں کا صحیح استعمال اور خوبصورت تراکیب اس بند میں ملاحظہ ہو۔

اتّی پتّی چباچبا کر جو جھ رہا ہے دیس
موت نے کتنے گھونگھٹ مارے بدلے سو سو بھیس
کال بکٹ پھیلائے دیا ہے بیماری کا جال
اے ساتھی بیماری کا جال
بھوکا ہے بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

بنیوں، ساہوکاروں اور مہاجنوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کی سازشوں کا پردہ وامق نے کس طرح فاش کیا ہے۔جس کے بدولت ایک دو نہیں لاکھوں افراد موت کی بھینٹ چڑھ گئے اور ہزاروں

مظلوم عورتیں ایک سیر چاول کے لئے بک گئیں

کوٹھریوں میں گانج بیٹھے بنئے سارا اناج

سندر ناری بھوک کی ماری بیچے گھر گھر لاج

بھوکا بنگال رے ساتھی بھوکا ہے بنگال

نظم کے ایک اور بند میں وامق نے ملک اور قوم کے خوابیدہ، بے حس اور مردہ ضمیروں کو کس طرح للکار کر بیدار کرتے ہیں۔

دھرتی ماتا کی چھاتی پر چوٹ لگی ہے کاری

مایا کالی کے پھندے میں وقت پڑا ہے بھاری

اب سے اٹھ جانید کے ماتے دیکھ تو جگ کا حال

اے ساتھی جگ کا حال

بھوکا ہے بنگال [1]

بظاہر یہ نظم قحط سے متعلق ہے لیکن پیرائے اور خوبصورت انداز سے وامقؔ نے اس کی منظر کشی کی ہے کہ سننے والیکو یہ محسوس ہوتا ہے گویا وہ خود موقع واردات پر ہر بات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہے اور ایک فنکار کے فن کی اصلی خوبی یہی ہے۔

جس زمانے میں مجازؔ کی نظم آوارہ ہر نوجوان ذہنوں کی ترجمان بنی ہوئی تھی اسی زمانے میں وامق کی نظم ''مینا بازار'' ہے جو ان صنف نازک کی انگلیوں کی ایک بولتی تصویر ہے جن کی کمزوریوں، لاچاریوں سے سماج کے سفید پوشوں نے انہیں نوچا کھسوٹا اور پھر اسے سماج نے باہر بھی کر دیا اور جسے عرف عام میں طوائفوں کا نام دیا گیا جس طرح وامق کی نظم بھوکھا بنگال بڑے چھوٹے شہروں قصبوں میں کسان مزدور کو اس کی شکل میں گاتے ابھرتے رہے، اسی طرح ''مینا بازار'' کی مقبولیت کا یہ عالم تھا

---

[1] وامق کی نظم ''بھوکا ہے بنگال''

کہ اس کے مصرعے سب کے دل میں گونج رہے تھے بلاشبہ اسوقت مجاز کی آوارہ اور وامق کی نظم ''مینا کا بازار'' ہر محفل کا خاص موضوع ہوا کرتی تھی مینا بازار میں وامق نے جس انداز سے سماج کی بخشی ہوئی اور پھر سماج کے ہاتھوں ٹھکرائی ہوئی صنف نازک تصویر کشی کی ہے اس سے بھلا سماج کا کوئی بھی طبقہ متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا ہے مینا بازار کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

لب خموش ہیں نئی کہانیاں لئے ہوئے
رخوں پہ غازہ سے لدی جوانیاں لئے ہوئے
بنے ہوئے دماغ و دل میں کتنے شعلے مستقل
یہ وہ خزاں رسیدہ ہیں بہار جن سے منفعل
زمانے کے سلوک سے
یہ تنگ آ گئے بھوک سے
گڑ وہی ہیں ایڑیاں
مذلتوں کے غار میں
اور انتقام کے لئے
کھڑی ہیں انتظار میں
سماج کی یہ بیٹیاں
سماج کی یہ بیویاں

یہ وہ ہیں جن کی زندگی
مسرتوں سے دور ہے

یہ وہ ہیں جن کی ہر ہنسی

جراحتوں سے چور ہے

یہ وہ ہیں جن کا گھر بلندیوں میں رہ کے لست ہے

یہ وہ ہیں جن کی فتح بھی شکست ہی شکست ہے

مگر انھیں یہ سنگ ساریوں کا حکم عام ہے

وجود میں یہ کب سے اور کس طرح آ گئیں [۱]

دراصل جرأت و بیبا کی شعور اور سلیقہ مندی جوان کو اپنے ماحول سے ورثے میں ملا تھا۔ وامق اسے آخری سانس تک سینے سے لگائے رہے اور سخت سے سخت حالات میں بھی اس کے خلاف سمجھوتہ نہیں کیا۔ بقول ایس۔ ایم عباس کے

''وہ بات کے لئے ہمیشہ ایک حسین پیرایۂ اظہار چاہتے ہیں انھوں نے شاعری کے لئے ایک لغت تیار کی ہے جس میں ان کے تصور فن کے ساتھ ان کی طبیعت کے جلال و جمال کا حسین امتزاج ملتا ہے ان کی لغت کی اجمالی تفسیر یوں ہے'' [۲]

شعر ذکر بتاں، شعر فکر جہاں، شعر عطر زباں

شعر ہے ایک فسوں، کیا خرد، کیا جنوں اس کے زیر اثر

واسطے پُر خطر ہر قدم ایک سفر، زندگی مختصر

شیشۂ دل میں بس بھر دے یادوں کا رس اے بیجا نفسی

جز ترے شوق کے اس غم دہر سے ورنہ کس کو مفر

وامق ایک فن کار کی حیثیت سے فن کو خود کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور فن کے بارے میں ان کا

---

۱ وامق جونپوری ''مینا بازار''

۲ ایس۔ ایم عباس

کیا نظریہ ہے ان کی نظم ''فن'' پڑھنے کے بعد اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

میں فن ہوں میری انگلیاں ہیں زندگی کی نبض پر
میں زندگی کا آئینہ، میں زندگی کی جان ہوں
ضمیر عقل و ہوش ہوں، جنوں کی آن بان ہوں
کبھی میں پھول سے بھی نرم، گلشن حیات میں
کبھی تلاطم حیات میں، کڑی چٹان ہوں
میں ہجر ہفت رنگ ہوں کمال آزری ہوں میں
نشمین نگاہ، منتہائے دلبری ہوں میں
کبھی الجھ گیا تو زلف یار بن گیا ہوں میں
سنور گیا تو سو لہو سنگھار بن گیا ہوں میں
میری زبان شاعری، میرا قلم مصوری
طرب میرا نفس نفس جد مراصنم گری
حراحت خیال سے جہاں تک اٹھی حسیں
تو میں نے جذب کر لیا ہے گرمئ خیال کو
جہاں بھی مامتا کے ہونٹ جھک گئے ہیں گود میں
تو میں نے کسب کر لیا ہے گرمئ خیال کو

جہاں بھی حق کی بات دب گئی ہے شعور ظلم میں
اٹھا لیا ہے میں نے اپنے سر پہ آسمان کو
جہاں کہیں عوام کا سوال بن گیا ہوں میں

تو جابروں کی جان کا وبال بن گیا ہوں میں

میں فن ہوں، میری انگلیاں ہیں زندگی کی نبض پر (فن)

مندرجہ بالا نظم جہاں وامق کے نظریۂ فن پر روشنی ڈالتی ہے وہیں ان کے خیالات وجذبات، اعتقادات کی بھی بھرپور عکاسی کرتی ہے وامق نے اپنی ایک دوسری نظم ''زمین'' کو جس طرح اپنے حسن تخیل سے سنوارا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنے محبوب کا ہر عکس لفظوں میں پروئے چلے جارہے ہیں۔

اے میری پیاری زمیں، کتنی جواں اور حسیں نوع بشر کی امیں

تو دس زمانہ آفریں گلبدن، مہ جبیں، خاک تیری دلنشیں

تیرے چمن زار پر، دامن کہسار پر، ہردرو دیوار پر

حسن کی ہر شادیاں عشق کی چنگاریاں فکر کی گلکاریاں

شمع تیری آفتاب، جس کے تو گرد کنار پھرتی ہے پروانہ وار

چاند کی لے کر سپر تو یونہی شام وسحر رہتی ہے گرم سفر

گردش زمین وقمر وکائنات کی کتنی خوبصورت منظرکشی سائیک نظریہ کے تحت کی گئی ہے۔

قلب میں ہے ترے آگ، جھرنوں میں ہے تیرا راگ کھیتوں میں تیرا سہاگ

زروں میں تیرے چمک، جسم میں ترے مہک، چہرے پر ترے نمک

بطن میں ترے نہاں ہر شجر وامستخواں، زیست کا سنگِ نشاں

قبل عتن ترا حال ہی کچھ اور تھا اندھیوں کا دور تھا

زلزلوں کے کرب میں آگ بگولا تھی تو شعلوں کا جھولا تھی تو

آدمی کی ماں بنی، دولت، دہقاں بنی لطف کا ساماں بنی

عاشق مزدور تو مائی رنجور تو مامتا سے چور تو

تجھ پر اگائے گئے گلشن صورنگ وبو کر کے پسینہ لہو
کتنی ہی تہذیبوں کا بن گئی گہوارہ تو پہلے تھی انگارہ تو
تیرے یہ سب اضطراب ، جلد ہی لانے کو ہیں اک بڑا انقلاب
اے مری پیاری زمیں ، کتنی جواں اور حسیں ، نوع بشر کی امیں (زمین)

[1] ایس ایم عباس شخص اور شاعر

''ہمارے اکثر ادیب حقائق کی برہنہ تصویریں پیش کرتے ہیں سوالات ہی سوالات اٹھا دیتے ہیں لیکن ان کا حل نہیں پیش کرتے ہیں یہ مخفی ادب کا ایک پہلو ہے ادب صرف تنقید حیات نہیں تعمیر حیات کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ وامق کی نگاہ اکثر اس نکتہ پر ہے اپنی نظم ''آنکھیں'' جو قومی یکجہتی پر ہے اس میں وامق نے جہاں تلخ حقائق بیان کئے ہیں وہیں مسائل کا حل بھی پیش کیا ہے۔ [1]

آنکھ گاتی بھی ہے روتی بھی ہے سنتی بھی ہے
اس کی نظروں میں بلندی بھی ہے پستی بھی ہے
کبھی ٹپکاتی ہے امرت کبھی ڈستی بھی ہے
کبھی ویراں کبھی ارمانوں کی بستی بھی ہے

یوں کو دنیا کی نگاہوں میں نعمت آنکھیں
ہاں مگر اپنے لئے بن گئیں لعنت آنکھیں

اپنی ان آنکھوں سے کیا کیا دیکھا ہم نے
کیا لہو سڑکوں پہ بہتے نہیں دیکھا ہم نے
آدمیت کو سسکتا ہوا نہیں دیکھا ہم نے
یاد رندوں کو چھکڑ تے نہیں دیکھا ہم نے

---

[1] ایس ایم عباس شخص اور شاعر

ہے کوئی ایسا جواب ہم سے ملائے آنکھیں
راہ میں دیدۂ پرنم کے بچھائے آنکھیں

یہ تماشے تو شب وروز ہوا کرتے ہیں
خون کے دائرے بن بن کے مٹا کرتے ہیں
آئے دن زاویے کاغذ پہ بنا کرتے ہیں
کتنی باتیں ہیں جو ہم جھوٹ لکھا کرتے ہیں

دل میں کچھ ہوتا ہے لکھتے ہیں قلم سے ہم کچھ
یوں بھی کرتے ہیں سمجھو تہ ستم سے ہم کچھ

اور پھر اگلے بند میں اپنے کرب کا اظہار دلاسا دلا کر کرتے ہیں اور اس کا حل پیش کرتے ہیں۔

یاسیت کا ہمیں ملزم نہ بناؤ یارو
آگ جو دل میں لگی ہے وہ بجھاؤ یارو
یہ جو ممکن نہیں تو رحم نہ کھاؤ یارو
ہم ہیں حق گو ہمیں سولی پہ چڑھاؤ یارو
یا ہمیں گنگ بنادو ہمیں بہرا کردو
چھین لو آنکھیں ہماری ہمیں اندھا کردو

''آنکھیں''

آگے کے بند میں وامق کس طرح لوگوں کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر تمہیں حالات کو بدلنا ہے تو اس کے لئے ہمیں کردار کو بدلنا ہوگا۔ دستار بدلنے سے مسئلے کا حل نہیں اس کے لئے دستار بدلنے کے بجائے سروں کو بدلنے کی ضرورت ہے فکر نظر میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور بغیر کردار سازی کے کسی مسئلے کا کوئی حل نہیں نکل سکتا۔ اگلے بند میں وامق کا تیور ملاحظہ ہو۔

ذہن کرتا نہیں اب کھوکھلی باتوں کو قبول
ایسے موضوع پر ہوتا ہے قلم بھی مجہول
نعرہ یکجہتی کا اس ملک میں تب تک ہے فضول
جب تلک قوم کا کردار نہ ہوگا معقول
اس لئے قوم کا ڈھانچہ ہی بدلنا ہوگا
ملک کو ایک نئے سانچے میں ڈھلنا ہوگا۔ ''آنکھیں''

جاپان کے ''ہیروشیما اور ناگا ساکی'' پر ایٹم بم مارا گیا۔ آناً فاناً دونوں شہر خاک کا ڈھیر بن گئے۔ پورا جاپان ہی نہیں پوری دنیا اس ہولناک تباہی پر لرز اٹھی ہر طرف سے احتجاج اور فریاد کی آوازیں آنے لگیں ہر باضمیر انسان کے دل سینوں میں تھرتھرا اٹھے ایسے میں اس کے خلاف ہمارے ادیب وشاعر بھی میدان میں کود گئے اس کے خلاف بہت سے مقالے، افسانے اور نظمیں لکھی گئیں بھلا وامق جیسا دردمند و بیباک شاعر کیسے خاموش رہ سکتا تھا انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار اپنی نظم ''مایٹی ایٹم'' میں اس طرح کیا ہے۔

بحر ظلمات میں پھر ڈوب گئی نبض سکوں
خوف سے اور دھڑکنے لگے سہمے ہوئے دل
اپنی کمزوری کے احساس کی ماری مخلوق
زعم خود بینی میں اوروں کے زیاں سے غافل
اہرمن ہنس پڑا اس طرز جہاں بانی پر
کنگرے جھک گئے ایوانوں کے ہلنے لگے در
کس قدر بے بس وکم مایہ نظر آتا ہے
جب گراں قدر کو محدود کیا جاتا ہے

ذہن انسانی کا اس درجہ مزین شہکار
صرف بربادیٔ انساں ہوا جاتا ہے
اپنے ان ہاتھوں نے اپنا ہی گلاکھونٹ دیا
قافلے والوں نے خود قافلے کو لوٹ لیا

''مائیٹی ایٹم''

ایٹم کی طاقت پر انسانی کنٹرول بیشک ایک شاندار پیش رفعت سائنس کی تھی۔ اس کے صحیح اور تعمیری استعمال سے دنیا کو جنت بے نظیر بنایا جا سکتا تھا۔ مگر اس کے غلط استعمال سے دنیا کانپ اٹھی اور آج بھی اس کے خوف سے پوری دنیا لرزہ براندام ہے کہ نہ جانے کب کسی سر پھرے کے ایک اشارے پر یہ دنیا راکھ کا ڈھیر بن جائے، اگلے بند میں واثق نے اس نکتے پر کتنے پر درد انداز میں اس کا اظہار کیا ہے۔

ہم نے چاہا تھا کہ اس قوت بے پایاں سے
اپنی خود ساختہ دوزخ کو بنالیں جنت
نہ کہ امید جو کچھ تھی بھی وہی مٹ جائے
جنس انسانی کی دنیا میں رہی کیا قیمت
پھٹ کے ذرے بھی فنا ہوگئے کچھ کر نہ سکے
دامن زیست تہی کر گئے اور بھر نہ سکے ''مائیٹی ایٹم''

ہندوستان کو آزادی تو ملی مگر ملک کی تقسیم نے پورے برصغیر کے دلوں پر جو چرکے لگائے اس کے زخم لاکھوں جانوں کی قربانی دینے کے بعد آج بھی بھر نہ سکے۔ تعصب، تنگ نظری، نفرت پوری طرح دیوانگی میں تبدیل ہوگئی۔ جس پر پورا برصغیر چیخ اٹھا اور ابھی تک اس کی چیخ مدھم نہیں ہوئی ہے۔ ایسے میں ہندوستان کے ادیبوں اور دانشوروں نے برہنہ فرقہ واریت کے خلاف اپنی قلموں کو شمشیر

برہنہ بنادیا اور بلاشبہ قلمکاروں کی اس صف میں وامق پیش پیش تھے۔ وامق کی نظم ''تقسیم پنجاب'' سے وامق کے دل کا درد صاف جھلکتا ہے۔

بٹ گئے ہوش کے محور سے تمدن کے قدم
زندگی برسوں کی بیمار نظر آتی ہے
یوم آزادی کا ہر لمحہ جھکائے ہوئے سر
جس کی ہر سانس میں مدفون تعفن لرز اں
دادخواہی کے لئے پھر سوئے مغرب ہے رواں
چل رہی ہے سر بازار چتا غیرت کی
موت اور زیست کے دوراہے پہ پہرا دینے

جیسے اب خشک ہیں پنجاب کے سارے دریا
سونے کی بالیاں جن کھیتوں میں لہراتی تھیں
اب انہیں کھیتوں میں اڑتے ہیں حیا سوز شرار
اور لہو سے انہیں سیراب کیا جاتا ہے
اب یہ پنجاب نہیں ایک حسیں خواب نہیں
اب یہ دوآب ہے سہ آب سے پنجاب نہیں
اب یہاں وقت الگ صبح الگ شام الگ
مہ وخور شید الگ نجم فلک گام الگ
اسی تقسیم نے پنجاب تجھے لوٹ لیا
مرغ زاروں کو ترے کھاگئی منحوس نظر

اب رگوں میں تری پگھلی ہوئی چاندی نہ رہی
اب ترے حسن میں وہ پہلی سی مستی نہ رہی
سوہنی اب نہ مہینوال کوئی گائے گا
اب یہاں ہیر کو رانجھا نہ کبھی پائے گا
بٹ گئے ہوش کے محور سے تمدن کے قدم
زندگی برسوں کی بیمار نظر آتی ہے [1]

ابھی وطن آزاد ہوئے دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ ''مہاتما گاندھی'' جسے دنیا اہنسا کا پجاری کے نام سے جانتی تھی کسے خبر تھی کہ اس اہنسا کے پجاری کا خود اسی کے وطن میں اپنے لوگوں کے ہاتھوں خون ہوگا۔ گاندھی جسے وطن پرست اور صلح وانسان کے اس بہیمانہ قتل پر پوری دنیائے انسانیت کا بلبلا اٹھنا ضروری تھا۔ پھر وامق اس سے الگ کیسے ہو سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی نظم ''میر کارواں'' میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دلی رنج وغم کا اظہار یوں کیا ہے۔

جواب اس کا کون دے
کسے اب اتنا ہوش ہے
کہ آج ملک کس کے سوگ میں سیاہ پوش ہے
جواب اس کا کون دے
یہ کس کا خون بہ گیا
یہ کون قتل ہو گیا
کہ خود ہمارے ہاتھ اس لہو میں ہیں رنگے ہوئے

---

[1] وامق کی نظم ''تقسیم پنجاب''

وہ زندگی کا رازداں

وہ بیکسوں کا پاسباں

وطن کا میر کارواں

نظر سے دور ہو گیا

وہ جام جو چھلک رہا تھا

حریت کے مکدے میں دیر سے مہک رہا تھا

چور چور ہو گیا

نظر سے دور ہو گیا

.....

وہ بوڑھی سوکھی ہڈیوں کا ایک کانپتا بدن

مگر اسی میں اس قدر جواں لہو تھا موجزن

کہ جس کی بوند بوند میں بس تھی الفت وطن

.....

تمام عمر درس امن و آشتی دیا کیا

تمام عمر جو اسی امید پر جیا کیا

کہ ایک دن ضرور آئے گا - کہ جب

فساد دیر و کعبہ کا یہ کھوکھلا طلسم ٹوٹ جائے گا

وہ ہمارا رہنما

ہمیں سے آج چھوٹ گیا

سہاگ مادر وطن کا اپنے ہاتھوں لٹ گیا

غلط کہ میر کارواں

غلط کہ اپنا پاسباں

نظر سے دور ہوتے ہی دلوں میں کھینچ کے آ گیا

شکستہ تار روح و جسم قوم کو ملا گیا

نگار زندگی کو اس قدر حسیں بنا گیا

کہ موت کا سیاہ دیو

اپنی لعنتوں کے میں دب کے رہ گیا

سیاہ دل میں جس قدر سفید خوں تھا بہہ گیا

جو رہ گزر اداس ہو رہی تھی جگمگا اٹھی

ہمارا نوجوان قافلہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا

نقیب وقت سے کہو پھر

کہ انقلاب کے وہی پرانے نعرے پھر لگائے

جو راستوں سے ہٹ گئے ہیں ان کو راہ پھر دکھائے

یہاں تلک، یہاں تلک

کہ باقی کوئی رہ نہ جائے

وہ چاند جو نظر سے چھپ گیا تھا بن کے آفتاب

دلوں کو اک نئی شعاع زندگی میں گوندھتا

بلند ہوتا جارہا تھا مشرقی فضاؤں میں

پھر اتحاد کے پھریرے کھل گئے فضاؤں میں

''میرا کارواں''

یہ الگ بات ہے کہ وامق نے جس اتحاد کے پھریرے کو فضاؤں میں لہرانے کی بات کی ہے وہ ابھی دور بہت دور تک نظروں سے معدوم ہے۔

وامق کی نظموں میں جہاں جوش وولولہ ہے جینے کا حوصلہ ہے وہیں کبھی کبھی حالات سے لڑتے لڑتے وہ تھکے تھکے سے معلوم ہوتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان پر یاسیت کا غلبہ ہوتا جارہا ہے۔ جیسے ان کی نظم ''شرابی'' کا یہ بند ؎

دھندلا دھندلا ملگجا سا ہے چراغِ زندگی

زرد پڑتا جارہا ہے سبز باغ زندگی

خشک آتا ہے نظر مجھ کو ایاغ زندگی

غم زدہ کو مرکز غم کا پتہ چلتا نہیں

دائرے کو جیسے خود اس کا سرا ملتا نہیں

کیسے دل بہلے کوئی اپنا سوا ملتا نہیں

''شرابی''

لیکن ایسا نہیں ہے کہ حالات سے گھبرا کر اور مایوس ہو کر ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ گئے ہیں وہ حوصلہ ہارے نہیں ہیں بلکہ پوری قوت سے پابندی قرطاس کہن کے توڑنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی مشہور نظم ''اپنی تصویر'' کے ایک بند میں انکا تیور ملاحظہ کریں۔

توڑ دے توڑ دے پابندیٔ قرطاس کہن

توڑ دے توڑ دے اس شیش محل کی دیوار

قصر فولاد کی چوکھٹ سے نکل آ باہر
زنگ آلود نظر آتا ہے ہر بند رسن
توڑ دے توڑ دے اس قید کی تعمیر کہن

''وہ اپنی تصویر سے''

وقت حالات کے ہاتھوں کبھی کبھی انسان زندگی کے ایسے دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے جہاں ایک طرف امید کی ہلکی سی کرن زندگی کا وہ حوصلہ بخشتی ہے کہ انسان سخت حالات میں بھی حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے پوری قوت سے آگے بڑھتا ہے۔ وہیں دوسری طرف وہ مقصد حیات کی ناکامی پر اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ وامق اپنی مختلف نظموں میں اس کشمکش کے شکار نظر آتے ہیں۔

وقت کے جھٹکوں سے قانون ترا ٹوٹ گیا
جس کو ٹیکے تو کھڑا تھا وہ عصا چھوٹ گیا
کھل گئے تیری فسوں کاری کے سارے پھندے
وہ جو اک جال بنا کرتے تھے اوہام ترے
کرم خوردہ کسی چادر سے زیادہ تو نہیں
یہ ترا فلسفہ کہنہ و مجبور و غلام
ترا پارینہ تمدن ترا فرسودہ نظام
سب دھندلکے ہی تو ہیں ڈوب کے رہ جائیں گے
اک نئی صبح کے سیلاب میں بہہ جائیں گے

''گمراہ رہبر سے''

اس بند میں ان کے احساس بیچارگی کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے۔

وہی بے نور دماغ اور وہی چہروں پہ غبار
حسرتوں کا وہی پامال صنم خانۂ دل
وہی ہر ذہن میں امید کے اُلجھے ہوئے تار
تلخیٔ زیست سے چھلکے ہوئے پیمانۂ دل
انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی

''رقص بسمل''

مگر وامق حوصلہ ہارنے والون میں نہیں وہ برابر سماجی ناانصافیوں کے خلاف پیکار ہیں وہ دوسروں کو بھی ہر طرح کی قربانی دینے کی ترغیب دیتے ہیں اس جہاد میں شامل ہونے کے لئے وہ اپنے محبوب سے التجا کرتے ہیں اب بہت ہو چکا اب مجھے ان کے خلاف جہاد سے نہ روکو جانے دو ان کی التجا کتنی اثر انگیز ہے ان کا لہجہ کتنا پر اثر ہے دیکھنے کی چیز ہے اپنی نظم ''اس پار'' میں ان کی التجا کا انداز قابل دید ہے۔ ؎

ان ہیرے ایسے اشکوں کو عارض پہ لُنڈھا کر مت روکو
یاقوت کے ایسے ہونٹوں کو دانتوں سے چبا کر مت روکو
اک بات ہے جو رہ جائے گی یہ وقت کہاں پھر پاؤں گا
اس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

کب تک یہ زمانے کی دیوی آرام محل میں سوئے گی
اور اس کے بے حس قدموں پر کب تک یہ جوانی روئے گی
اور ہاتھ پہ اپنے ہاتھ دھرے کب تک میں یونہی پچھتاؤں گا
اُس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا ''اس پار''

سماج میں تو ہم پرستی تقلید، پارسائی کے لباس میں لوٹ کھسوٹ کا نقشہ کھینچ کر ان تمام کیڑوں پر طنز ملاحظہ ہو۔ ؎

کب تک یہ عمامہ کفر و دین کے ڈھونگ رچائے جائے گا
کب تک یہ پجاری دنیا کو انگلی پہ نچائے جائے گا
ان جھگڑوں سے جو پاک رہے وہ بستی ایک بساؤں گا
اس پار مجھے جانے بھی دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا

شاعر کتنا پر اُمید نظر آتا ہے اور اسے کامل یقین ہے کہ سماج کے فرسودہ نظام کے خلاف جو جنگ ہم نے چھیڑی ہے اس میں ہماری کامیابی یقینی ہے اور اس کا یہی یقین اسے ایک شاندار مستقبل کا خواب دکھاتا ہے۔ ؎

ایسا بھی زمانہ آئے گا جب ہم دونوں مل جائیں گے
ہر منظر کیف آگیں ہوگا ہر کیف پہ ہم لہرائیں گے
دنیا ہی نرالی پاؤ گی جس وقت میں واپس آؤں گا
اس پار مجھے جانے دو روکو نہ مجھے میں جاؤں گا [۱]

''اس پار''

ترقی پسند تحریک سے وابستہ قریب قریب ہر ادیب، شاعر ہو یا افسانہ نگار ڈرامہ نویس ہو یا ناول نگار سب پر اشتراکیت کا غلبہ ہوا اور سب کے سب ''انقلاب روس'' سے اس طرح متاثر ہوئے کہ ادبی دنیا میں ہر طرف للکار، یلغار، چیخ و پکار لوٹ، توڑ دو، نوچ لو کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند ادیب پر تنقیدیں شروع ہوگئیں کہ یہ ایک سیاسی بنگالی ادب ہے اس میں انتقام، نصرت اور غصہ کا اظہار زیادہ ہے جس کے باعث ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تحریک میں انتشار

---

[۱] واثق جونپوری کی نظم ''اس پار''

کے آثار نمایاں ہوگئے اور بیشتر شاعر وادیب نہ جائے رفتن نہ جائے ماندن کے شکار ہوگئے جذبی صاحب نے اپنے مجموعے ''فروزاں'' میں اپنی اس کشمکش کا اظہار کیا ہے۔

''میری کم گوئی کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ صحت کی خرابی سے قطع نظر ادب کے بدلتے ہوئے نظریات نے ایک عجیب الجھن پیدا کر دی تھی کبھی نعروں، کھری کھری باتوں یہاں تک کہ دشنام درازیوں کو ترقی پسندی سمجھ لیا گیا، کبھی تکنیک پر اتنا زور دیا گیا کہ یہی ترقی پسندی کی علامت بن گئی ہم میں سے اکثر ترقی پسندی کے دور میں ادب کے تقاضوں کو بھول گئے چنانچہ اس دور میں جو ادب پیدا ہوا ہے اسے ہم مشکل سے ادب کہہ سکتے ہیں''

ترقی پسند ادب میں نئے رجحان کو دیکھ کر سجاد ظہیر کو کہنا پڑا:

''واعظانہ اور خطیبانہ انداز بھی ہماری شاعری میں کافی پایا جاتا ہے یہ بھی پرانے طرز کی شاعری کا ایک ترکہ ہے جس سے ہم دامن چھڑا لیں تو اچھا ہے.....
نوجوانوں سے خطاب، طالب علموں سے خطاب سپاہی سے خطاب اب بند ہونا چاہئے ورنہ لوگ آپ کا بھی مذاق اڑائینگے'' [۱]

ڈاکٹر عبدالعلیم نے ترقی پسند ادب پر منڈلاتے ہوئے خطرات کے پیش نظر اپنے ہمنواؤں کو اس طرح آگاہ کیا۔

''ہمارے اکثر ادیب انقلاب کا خوش آئند خواب اس طرح دیکھتے ہیں کہ جس طرح کوئی عاشق، اپنی محبوبہ کا تصور کرتا ہے ان کے لئے مزدور، کسان سرمایہ دار طبقاتی کشمکش اور انقلاب کی وہی حیثیت ہے جو غزل گو شعراء کے لئے، گل وبلبل، ہجر ووصال، ساقی وبادہ رقیب ومحتسب وغیرہ کی گویا وہ ایک نئی ادبی روایات کے پرستار ہیں

---

[۱] خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ص ۱۱۹

''ہمارے اکثر ادیب انقلاب کا خوش آئند خواب اس طرح دیکھتے ہیں کہ جس طرح کوئی عاشق، اپنی محبوبہ کا تصور کرتا ہے ان کے لئے مزدور، کسان سرمایہ دار طبقاتی کشمکش اور انقلاب کی وہی حیثیت ہے جو غزل گو شعراء کے لئے، گل وبلبل، ہجر ووصال، ساقی وبادہ رقیب ومحتسب وغیرہ کی گویا وہ ایک نئی ادبی روایات کے پرستار ہیں اور ان کی تخلیقات میں خود ان کے تجربے کو بہت کم دخل ہے'' [۱]

مجنوںؔ گورکھپوری نے اپنے اضطراب کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

''ہمیں اپنے ادب کو ایک مہلک اور غلط میلان سے بچانا ہے یہ ایک ایسا خطرہ ہے جو عصر حاضر کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہمارے ادیب اسلوب کو کچھ غیر اہم سمجھتے ہیں وہ مواد کو اسلوب سے الگ کر کے اس پر زور دیتے ہیں جو فعل عبث ہے بے اسلوبی جدید ادب کی ایک شان بن گئی ہے۔ ہمارے نئے ادیبوں کو اس راز سے آگاہ رہنا چاہیئے کہ مواد اور اسلوب لازم ملزوم ہیں اور زندہ ادب میں ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے'' [۲]

۱۹۵۰ء آتے آتے ترقی پسند ادب پر انگلیاں اٹھنے لگیں ان پر کھل کر تنقیدیں اور تبصرے شروع ہو گئے گویا اس کا احتساب شروع ہو گیا ترقی پسند ادب کے اس بحرانی اور ہیجانی دور میں ترقی پسند ادب کی وضاحت خلیل الرحمٰن اعظمی نے یوں فرمائی۔

''اس دور میں ترقی پسند مصنفین نے ادیبوں پر جا بجا احتساب کرنے شروع کر دئے تھے جس کی زد میں جذبیؔ خواجہ احمد عباس وغیرہ خاص طور پر آئے۔ بہت ادبی رسائل مثلاً ''نقوش'' ''ماہ نو'' آج کل نیا دور کا مقاطعہ کیا گیا اور انجمن کے وفاداروں نے

---

[۱] خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''

[۲] مجنوں گورکھپوری ''ادب اور زندگی''

ان رسائل میں اپنی چیزیں بھیجنی بند کر دیں جو لوگ ان رسائل میں لکھتے ان کی ترقی پسندی مشتبہ قرار دی گئی ممتاز حسین کا ایک بلند پایہ مقالہ ''ماضی کے ادب عالیہ'' نقوش کے سالنامہ میں شائع ہوا تو رسالہ ''محاذ'' میں اس مضمون کو رجعت پسندانہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی'' [۱]

دراصل ترقی پسند تحریک و ترقی پسند ادب کی آندھی اتنی تیز تھی کہ بہت مختصر عرصہ میں ہندوستان کے بہت کم ادیب اور شاعر اپنے کو اعتدال پر رکھ سکے۔ دراصل ترقی پسندوں نے اپنی ترقی پسندی کے زعم میں اپنے کو ہر قید و پابندی سے آزاد سمجھ کر اخلاقی قدروں کی بھی پرواہ نہیں کی جس کے نتیجے میں یہ تحریک اپنی کم عمری ہی میں یعنی صرف بیس سال کی عمر میں اپنی موت آپ مرگئی اس دور کشاکش میں وامق بھی اپنے دامن کو بچا نہیں سکے۔ قدیم فنکاروں اور ادیبوں نے ترقی پسند ادیبوں آزادانہ ادبی بے راہ روی پر تنقیدیں کیں تو وامق نے اس کا جواب اپنی نظم ''مداوا'' میں اس طنزیہ انداز سے دیا۔

کتنے بیباک ہیں شاعر اب کے — کتنے عریاں ہیں یہ افسانہ نگار
کچھ سمجھ میں مرے آتے ہی نہیں — ان ادب سوزوں کے گنجلک اشعار
یوں تو اپنے کو یہ کہتے ہیں ادیب — پڑھتے ہیں جنگ کے لیکن اخبار
کبھی یورپ کا کبھی پورب کا — ذکر کرنے میں اُڑاتے ہیں شرار
داستانیں نہ قصیدے نہ غزل — ادب تلخ کی ہر سو بھر مار
خون آلودہ ہیں ان کی نثریں — پیپ بہتے ہوئے ان کے اشعار
ان کے افسانوں کے موضوع عجیب — کالی لڑکی ، کبھی کالی شلوار
ان کی نظموں میں کوئی لطف نہیں — نہ کوئی نغمہ نہ تضمیر بہار
کبھی آوارہ کبھی خانہ بدوش — کبھی عورت ، کبھی مینا بازار

---

[۱] خلیل الرحمٰن اعظمی - اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص ۹۹

ایک میں بھی تو ہوں پکّا شاعر　　مگر ان باتوں سے بالکل انکار
سندِ ماضی سے پُر میرا کلام　　فکر امروز سے کرتا ہوں فرار
گورکی جابرو نذر الاسلام　　یہی دو چار ہیں ان کے معیار
سننے میں آیا ہے بہرے مرے کان　　کہ خدا سے بھی انھیں ہے انکار
مذہبوں سے انھیں بے حد نفرت　　معبدوں پر سے اڑاتے ہیں غبار
میں تو عاجز ہوں الٰہی توبہ　　آخر آئے گا کبھی ان کو قرار
کوئی للہ ہٹاؤ ان کو
جاگ اٹھے ہیں سلاؤ ان کو

''مداوا''

غرض یہ تحریک اسی طرح جواب الجواب کی نذر ہو کر قریب قریب پھر اپنے پُرانے ڈھرے پر آ گئی ترقی پسند تحریک وادب کا دور بہ مشکل بیس، پچیس سال سے زیادہ کا نہیں رہا۔ لیکن اس مدت میں اردو ادب میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا۔ مگر بقول خلیل الرحمٰن اعظمی کے

''ترقی پسند تحریک نے پچھلے پچیس سالہ دور میں اردو زبان کے شعری سرمائے میں جو کچھ اضافہ کیا ہے اسے اگر تخلیقی ادب کے اعلیٰ فنی اور جمالیاتی۔ معیار پر جانچا جائے تو اس کا بہت کچھ حصہ نارسیدہ اور ناتراشیدہ ہونے کے سبب ناقابل التفات قرار دیا جائے گا۔ [۱]

ترقی پسند تحریک وادب کی گھن گرج سے وامق جیسا اعتدال پسند بھی اچھوتا نہ رہا ان کی بعض نظموں میں اس کی للکار صاف سنائی دیتی ہے ان کی چند چنیدہ نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

---

[۱] خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''

پی رہا ہوں اپنی قوت آزمانے کے لئے
پی رہا ہوں نقش کہنہ کو مٹانے کے لئے
پی رہا ہوں تاش کے اس گھر کو ڈھانے کے لئے
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اٹھایا جامِ مئے

پنڈت و ملا سبھی کھو بیٹھے اپنا اعتبار
جس طرح شاہیں کے چنگل سے نکل جائے شکار
اس ریاکاری سے بہتر ہے میکش کا خمار
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اُٹھایا جام مئے

سیکڑوں صدیوں کا ہے ہیجان سینے میں مرے
انگنت بدلوں کا ہے ارمان سینے میں مرے
کروٹیں لیتا ہے ایک طوفان سینے میں مرے
یہ نہیں تو کس لئے میں نے اٹھایا جامے مئے

''شرابی''

جی میں آتا ہے کہ قانونی حدوں کو توڑ دوں
طاق زندانِ تمدن کی سلاخیں موڑ دوں
شیشۂ مذہب کو سنگ معصیت سے پھوڑ دوں
ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

جگمگاتے شیش محلوں پر نظر جاتی ہے جب
جاگ اٹھتے ہیں مرے خوابیدہ ارماں سب کے سب
باندھ کر مٹھی چبا لیتا ہوں میں دانتوں سے لب

ایسی حالت میں بھی کیا مجھ سے محبت ہے تمھیں

''پاپی''

تن ہارے تو ہارے راہی من کے پاؤں نہ تھکنے پائیں

سائے بھی لمبے ہو ہو کر پربت کا منھ چوم رہے ہیں

سورج بھی اب خون اُگل کر

کالے کفن میں چھپ جائے گا

دھرتی کی چھاتی دہلے گا

لاشوں کا انبار لگے گا

''چڑھائی''

اس کے علاوہ ان کی بعض نظموں میں اس طرح کے انداز دیکھنے کو ملیں گے۔مگر یہ ان کی شاعری کے اوائل کی نظمیں ہیں بعد میں انھوں نے اس سے مراجعت اختیار کر لی اسی لئے ان کی بعد کی شاعری کو بہترین شاعری کا درجہ دیا جا سکتا ہے بعد میں انھوں نے دل دوز اور پر اثر نظمیں لکھیں جو شاید اپنے اثر کے لحاظ سے کبھی پرانی نہیں ہونگی جب مادر وطن کی زبان سے اس کی فریاد ؟

کس نے ان آہنی دروازوں کے پٹ کھول دئے

کس نے خونخوار درندوں کو یہاں چھوڑ دیا

کس نے آنچل پہ مرے ڈال دئے انگارے

ٹھیک سے کٹنے بھی پایا نہ تھا طوق گردن

ابھی تو صدیوں کا پامال تھا میرا خرمن

اُس پہ ان وحشی لٹیروں نے سیہ کاروں نے

میرے ارمانوں کو تاراج کیا لوٹ لیا

میری معصوموں کو بے خانہ وبرباد کیا
میری بہوؤں سے ہوس خانوں کو آباد کیا
میرے پیارو میری چھاتی سے لپٹنے والو
آگ وہ دل میں لگی ہے کہ میں ہی جانتی ہوں
یوں مری کوکھ جلی ہے کہ میں ہی جانتی ہوں
میرے بچوں میری ناموس کے پہریدارو
دیکھو نیزوں پہ تمھارے ہیں یہ کس کی لاشیں

تم نے خود لوٹ لیا اپنی ہی بہنوں کا سہاگ
مانگ میں جھونک دی سیندر کی جگہ تم نے آگ

شرم سے اب تو ہوئی جاتی ہے گردن مری خم
پانی پانی ہوا جاتا ہے مصور کا قلم
یہ ترا بیت مقدس تری رفعت کا مزار
کس کی منحوس نگاہوں کا بنا آج شکار

''ماں''

ان کی دوسری نظم جو ''عید'' کے عنوان سے ہے اس کو پڑھنے سے اُس وقت کے حالات کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔

زباں پر عید کا نغمہ ہے دل مرجھایا جاتا ہے
لبوں پر ہے تبسم اور کلیجہ منھ کو آتا ہے

کہ ننگا ہے کسی کمبخت کا جسم آج کے دن بھی
کہیں دیبا واطلس کا عمامہ جگمگاتا ہے

گلے ملنے کا ساماں اور یہ پائیں باغ کا سج دھج
یہاں عیش و مسرت کا سبق دوہرایا جاتا ہے
اُدھر اس میڈ پر اس سوچ میں بیٹھا ہے ایک دہقاں
کہ دیکھے آج کی ڈالی میں کیا انعام پاتا ہے

کہیں تو قہقہوں سے چھت اُڑی جاتی ہے ایواں کی
کہیں اُمید کا ٹوٹا سا دیپک ٹمٹماتا ہے
یہ کیسی عید ہے اے دوست اس کو اور کچھ کہہ لے
کہ سنتے تھے ہلالِ عید رُوتوں کو ہنساتا ہے

''عید''

سیدھے سادے الفاظ میں وامق کے درس دینے اور سمجھانے کا یہ خوبصورت انداز بھی قابل داد ہے۔

تم نے سوکھے ہوئے بیلے بھی کبھی سونگھے ہیں
ان کو مسلا نہ کرو
کتنی آزردہ مگر بھینی مہک دیتے ہیں
ان کو پھیکا نہ کرو
غم سے کملائے ہوئے چہروں کو سمجھا بھی کرو
صرف دیکھا نہ کرو
دل میں رستے ہوئے زخموں کا مداوا بھی کرو

صرف چھیڑا نہ کرو

''سوکھے ہوئے بیلے''

ترقی پسند تحریک نے ترقی پسند ادب یا جدید ادب اور جدید آرٹ کے ذریعہ بھی یہاں کے ادیبوں، شاعروں، مصوروں کو بہت متاثر کیا یہ ایک الگ بحث ہے کہ اس نے عوام کو کس حد تک متاثر کیا مگر ہمارے اردو ادب کے اس دور کے فنکارون پر اتنا اثر ہوا کہ اگر وہ جدید ادب کی ڈگر پر نہیں چلیں گے تو ان کا شمار اردو ادب کے قلمکاروں میں نہیں ہوگا۔ یہ بات اور ہے کہ قریب قریب سب نے مراجعت اختیار کر لی اور اس کے نقوش اب خال خال ہی دکھائی دیتے ہیں۔ وامق مرحوم بھلا کیسے اچھوتے رہ سکتے انھوں نے بھی آزاد نظمیں لکھیں اور خوب خوب لکھیں۔ اس کے چند نمونے پیش ہیں۔ ؎

میرے ساتھی میرے ہمدم

بڑے پیغام مسرت یہ گماں مجھ کو بھی گزرا

کہ وطن ہو گیا آزاد

تیری چھاتی پہ ہیں اب تک وہ نشاں گولی کے باقی

جو چمک اٹھے ہیں آج

کہ ہوئی جاتی ہے خیرہ نگہ، مملکت و تاج

ابھی عفریب تہی دست کا ہے چاروں طرف راج

ان کی ایک آزاد نظم ''نیلا پرچم'' ہے جو ہیروشیما و ناگاساکی ایٹم بم سے تباہی کے اثرات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ قوم کو یوں خبردار کیا ہے۔ ؎

ہم اس لئے امن چاہتے ہیں

کہ آج ظلمات جنگ میں آب زندگی مل نہیں رہا ہے

اور امن ہی خضر زندگی ہے

حیات بے کیف ہو رہی ہے کہ ٹینک سی گھنگھناہٹوں میں ہمارا سنگیت کھو گیا ہے

جنگ، ملک، قوم اور زندگی ہی نہیں تہذیب و ادب کے نقوش بھی مٹا دیتی ہے

وہ ہیروشیما و ناگاساکی کا قاتل ابھی تک مرا نہیں ہے

ہماری مسجد کے اونچے اونچے مناروں کا سر جھنجھوڑ دے گا

ہمارے گنگ و جمن کی سیمین کلائیوں کو مروڑ دے گا

ہمارے یہ تاج اور اجنتا

جمامِ مرمر، جلال اسود

ہماری تہذیب کے امر کارنامے سے جن کے نقوش و گنبد

ہماری تہذیب کے خزینے

ہماری پندار کے سفینے

جوان ہی ہوئے تھے پیدا

جوان جو آج تک رہے ہیں

جوان تا زندگی رہیں گے

مگر اس ایٹم کے زلزلے میں شباب ان کا نہ ٹک سکے گا

ہماری تہذیب جس کے نغموں میں عشق روح پل رہی ہے

مصوری وہ کہ جس آنکھوں میں فکر کی شمع جل رہی ہے

وہ بت گری جس کے ساعد و قدر میں حسن کی آنچ ڈھل رہی ہے

اگر نہ یہ جنگ رک سکی تو

یہ سارے نغمے

یہ ساری شمعیں

تمام حسن ونظر کے جلوے

ہماری بزم خیال میں کبھی بھی پھر نہ آ سکیں گے

نشاں ہم ان کے نہ پا سکیں گے

قسم ہے اس عہد نو کی جس کو ہماری ہر سانس ڈھونڈتی ہے

قسم ہے اس بے نوا کسان اور غریب مزدور کے یقین کی

جو اپنی محنت کی زندگی میں

شریک باں کی برہنگی میں

کثیف بچوں کی گندگی میں

اندھری سی اپنی جھونپڑی میں

خیال فردا کی روشنی میں

قسم ان بے شمار قوموں کی جو آج ایک زبان ہو کر

یہ اعلان کر رہی ہے

کہ جنگ اب ہم نہ ہونے دیں گے

جو ایٹمی بم بنے ہوئے ہیں بہا دو ان کو سمندروں میں

کہ جنگ دشمن ہے زندگی کی

رخِ سحر سے نقاب اٹھا دو

ہمیں ضرورت ہے روشنی کی

''نیلا پرچم''

تبصرے کا حق ادا نہیں ہوگا جب تک ان کی نظموں کے مجموعے ''سفر نا تمام'' کی دو نظموں کو نہ دیکھ لیا جائے جس کے بارے میں خود وامق مرحوم خود نوشت سوانح میں یوں رقمطراز ہیں۔

''نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد نومبر ۱۹۶۰ء میں کشمیر سے اپنے وطن رکجگاؤں جونپور واپس آنے کے بعد بہت سے اشعار غزلیں اور نظمیں کہنے کے بعد میں نے دو بڑی فکر انگیز نظمیں کہیں ایک ''وقت'' اور دوسری ''سفر نا تمام'' جنھوں نے اُردو اور ہندی کے نئے ادیبوں اور نقادوں کو چونکایا تب انھوں نے میری پہلے کی تخلیقات میں مجھ کو دریافت کرنا شروع کیا'' [۱]

ان نظموں میں شگفتگی کے بیان بھلے ہی نہ ہو مگر مواد اور سماج میں پھیلی افراتفری گوناگوں مسائل، اخلاقی قدروں کی پامالی، محرومی وانتشار پر ان کی گرفت اور اس کے لئے ان کے دل میں چھپے ہوئے درد سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے وقت کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے مگر سب اس بات سے متفق ہیں کہ کائنات میں ہر شئے فانی ہے اور اگر ثبات ہے تو صرف خدا کے بعد وقت کو ہے۔ وامق نے فلسفہ وقت کی بڑے خوبصورت انداز میں تشریح کی ہے۔ [۲]

زندگی اک متحرک جادہ
ارتقا جس کا مدار
باد آب وگل ونار
زندگی جہد مسلسل پہ سدا آمادہ
زندگی حلقۂ ایجاد کی اک لامتناہی زنجیر
زندگی پیشۂ مزدور سی ترشی ہوئی پانی کی لکیر
وقت کی رو میں بہی جاتی ہے
وقت کی چھوٹی سی تصویر کہی جاتی ہے
وقت اک جوئے رواں
بیکراں

سیل رواں

وقت کا کوئی کنارہ ہے نہ اس کی تھاہ

اس کی ہر موج ہزاروں صدیاں

جزر و مد اس کے تواریخ جہاں گزراں

وقت رفتار ہے لمحات کا اک دھارا ہے

وقت دلدادو جہاں دار و جہاں آرا ہے

وقت دوّار ہے

تخلیق کا گہوارہ ہے

وقت فن کار ہے

تہذیب کا فوارہ ہے

وقت کے ہاتھوں کا ڈھالا ہوا شہکار انساں

وقت ادراک و کمالاتِ نظر دیتا ہے

پائے افکار کو توفیق سفر دیتا ہے

کبھی مٹی سے اگلواتا ہے الماس و گہر

کبھی ذروں کو بنا دیتا ہے شعلوں کا شجر

وقت جب چاہتا ہے حکم اجل دیتا ہے

وقت اک پھونک میں صورت ہی بدل دیتا ہے

وقت کی سانس ہے طوفان کا آہنگ خرام

اس کی ہر جنبش مژگاں ہے تعمیر کا پیام

اتفاقات کھلونے اس کے

حادثات دو جہاں وقت کے ہیں باز بچے

انقلاب اس کا مزاج

وقت ہر غم کا علاج

وقت ساقی بھی ہے بادہ بھی ہے پیمانہ بھی

پیاس بھی نشہ بھی ہے ساز بھی میخانہ بھی

اپنے رندوں کو عطا کرتا ہے اس زہر کا جام

جس کا ہر گھونٹ ہے پروانۂ جاگیر دوام

امتحان کے لئے ظالم کو پہنا دیتا ہے تاج

خون کے سکوں میں عشاق سے لیتا ہے خراج

دور سے چاہنے والوں کے نظر آتا ہے

اور جھکتے ہی نظر سن سے گزر جاتا ہے

اس کے قدموں کے نشانات مہ و مہر و نجوم

اس کی سنجیدگی طبع، کتابات و علوم

رنگ و بو اس میں کوئی ہے تو وہ دار و رسن

وقت مستقبل و ماضی کے سوا کچھ بھی نہیں

وقت کا راستہ سیدھا ہے کوئی پھیر نہیں

وقت میں دیر تو ہو سکتی ہے اندھیر نہیں

وقت کی سرعت و قوت کی کوئی ناپ نہیں

جوہر و روشنی و برق نہیں بھاپ نہیں

نہ کوئی شام ہے اس کی نہ کوئی اس کی سحر

کوئی خالی نہیں اس سے نہ خلا اور نہ ہوا

نہ کوئی خشک نہ تر

وقت ہر شے پر محیط

ایک آغوش بسیط

اس کے امکان میں اعداد کی پنہائی ہے

اس کی قدرت میں قیامت کی توانائی ہے

کبھی جلوت میں نہاں کبھی خلوت میں عیاں

خود تماشہ بھی ہے اور خود ہی تماشائی ہے

وقت اک ٹھوس حقیقت ہے نگاہوں سے پرے

ایک حیرت کا جہاں سات فصیلوں کے ادھر

وقت ہی وقت ہے وجدان کے پردوں کے ادھر

وقت دیرینہ ولا فانی ہے

وقت یکتائی میں لا ثانی ہے

جب نہ تھا کچھ تو فقط تھا یہ وقت

اور جب کچھ نہ رہے گا تو رہے گا یہ وقت

ابتداء کوئی نہ اس کی نہ کوئی اس کا عدم

اسکی وحدت جو کبھی بیش نہ کم

اس کا خالق نہیں کوئی نہ کوئی اس سے بڑا

یہی شاید حصے خدا.....

''وقت''

بلا شبہ اپنے موضوع ،فکری بصیرت ہیئت واسلوب کے اعتبار سے ایک شاہکار ہے ۔نظم کے آخر میں وقت کی اہمیت بڑھا کر رسول ﷺ کی اس حدیث مبارکہ کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ''زمانے کو برا نہ کہو کیوں کہ زمانہ خدا ہے''

اپنی دوسری نظم میں شاعر نے کشمکشِ حیات اور مسائل حیات سے دوچار سماج کی تصویر جس انداز سے کھینچی ہے اس سے شاعر کے دل کی کیفیت اور کرب کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے ''سفرِ ناتمام'' کے کچھ بند پیش ہیں۔ ؎

زندگی کون سی منزل پہ رکی ہے آ کر
آگے بڑھتی بھی نہیں راہ بدلتی بھی نہیں

ست رفتار ہے یہ دور عبودری کتنا
سخت و بے جان ہے یہ پیکر نوری کتنا

چاند اک خواب جو تھا
شہر امید تہہ آب جو تھا

جس کے ماتھے کا ننھا ٹیکہ
پائے آدم کے تلے آتے ہی

اترے چہروں کی طرح ہوگیا کتنا پھیکا
ہم جنوں کیش وطرح دار ہمیشہ کے جو تھے

بھاگئے سائے کے پیچھے دوڑے
داہنے بائیں جوڈالی نظریں

موت افلاس ، جفا عیاری
بھوت عفریت چڑیلیں خواری

ناچی گاتی ٹھرکتی ہنستی
قہقہے گالیاں لڑتی ڈستی

ہڈیاں چوستی یرقان زدہ لاشوں کی
پنجو میں تار کفن شعلہ دہن

بستی کی بستیاں جھلساتی ہوئی
شہر پہنچیں تو کھلے دریائے

چڑھ گیں سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ کھٹ
بند ہونے لگے پٹ

اگلے ایک بند میں نئے سرے سے تعمیر حیات کے لئے سماج کے لوگوں کو پکارتے ہیں، اکساتے اور للکارتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہیں یہ مسئلے حل کون کرے

مسئلہ یہ ہے کہ اب اس میں پہل کون کرے
آسماں دور ، زمیں چور کہاں جائے کوئی
کاش ایسے میں چلا آئے کوئی
دل آشفتہ کو بہلائے کوئی بتلائے کوئی
کس طرح بھولتی ہے خشک شجر میں کونپل
آؤ تعمیر کریں صفوں کا اک تاج محل
جس کو کہتے ہیں غزل

جنس الفت کی وہ اب گرمیٔ بازار نہیں
یہ سب دوکاندار ہیں کوئی بھی خیریدار نہیں
قدر اندازوں کے انداز ہیں بدلے بدلے
زخم لگتے ہیں مگر کچھ بھی مزے دار نہیں
غیرت شوق کہاں مرگئی اے اہل جنوں
آج عاشق کوئی رسوا سرِ بازار نہیں

جانے کیا پھولوں سے کہتی ہوئی گزری ہے نسیم
مسکرانے پہ کلی اب کوئی تیار نہیں
دیدنی ہوگیا ہے فاصلۂ جرم وسزا
اب کسی غم سے مداوا کو سرو کار نہیں
زندگی کون سی منزل پہ رُکی ہے وامقؔ

کوئی غم خوار نہیں راہ بھی ہموار نہیں

''سفر نا تمام''

اس کے علاوہ، فرقہ وارانہ فساد دہشت گردی، جنگ وغیرہ سے متعلق کئی اچھی نظمیں جیسے (ہم بزدل ہیں) (کل عدم کن فکاں) ماضی کی آخری ہچکی، آنکھ لگتے ہی، قدم کی جھنکار، گیت بھینگر، دوسری منزل ہم بزدل ہیں، زخموں کا شجر، کا شمار شاہکار نظموں میں کیا جاتا ہے جو اپنے اسلوب، انداز بیاں فکر جذب و کیف کے لحاظ سے بلا شبہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔

باب پنجم

وامق جونپوری کا نظریۂ شعر

وامق کا نظریۂ شعر

دنیا میں جب سے اشرف المخلوقات کہے جانے والے انسان نے انگڑائی لی ہے تبھی سے یعنی روز اول سے ہی خیر وشر اور حق و باطل ہمیشہ سے متصادم رہے ہیں اور ان کے امتحان آزمائش کے لئے قحط، بیماری، افلاس، ہوس اقتدار اور اقتدار کے لئے جنگ وجدال بھی وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں اور اس میں یہ انسانی گروہ اپنے اپنے داخلی، خارجی اثرات واقدار کی بنا پر یہ انسانی گروہ تقسیم ہوکر آپس میں متصادم رہا ہے۔

دراصل انسانی ذہن کی تعمیر بہت کچھ اس کے خارجی اور داخلی اثرات کے زیر اثر ہوتی ہے داخلی سے مراد اس کی سرشت فطرت وذہانت ہے جو اسے پیدائشی طور پر قدرت کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ اور خارجی اثرات سے مراد ہے جو اپنے ماحول سے ملا ہو۔ جس میں پیدا ہوا ہے اس کی سوسائٹی جس میں پلا بڑھا ہو۔ اور یہ خارجی اثرات انسانی تربیت کے لئے بہت اہم ہیں۔ انسان آغوش مادر سے لے کر عنفوان شباب تک اپنے انھیں خارجی اثرات سے متاثر ہوتا ہے ممکن ہی نہیں کہ کوئی انسان اپنے خارجی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر بچ کر نکل جائے ہاں جسے خود خدا نہ چاہے اور اس صف میں انبیاء کرام ہی آتے ہیں جنھیں خود صاحب مشیت ہی تربیت دیتا ہے پھر بھی جن لوگوں کی فطرت صالح ہوتی ہے ان میں غور وفکر کا جذبہ حاوی ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی اسی عادت وجذبے، خارجی اثرات سے پیدا ہونے والی برائیوں کو چھٹکتے رہتے ہیں اور بہت کم اس سے آلودہ ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ صالح فطرت لوگ اکثر کسی نہ کسی موڑ پر ضرور ہوتے ہیں اور غیر صالح اقدرا کے لوگوں کی اصلاح ناممکن ہوتی ہے خواہ وہ صالحین کے جھرمٹ ہی میں کیوں نہ رہیں۔

یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ وامق نے کس ماحول میں آنکھ کھولی ان کے خاندانی طنطنے اور

دبدبے کا یہ حال تھا کہ دو چار ضلع میں کوئی سرکشی پر آمادہ ہوتا تو اس کی گرفت سے پہلے اس سے سوال کیا جاتا کہ کیا تو اپنے کو ٹڑھواں (عرف عام میں آج بھی کچگاؤں کو آج بھی ٹڑھواں کہا جاتا ہے) کا سید سمجھتا ہے جہاں بقول وامق کے حویلی سے باہر نکل کر عوام الناس سے خلیط ملیط گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ حویلی کے اندر و باہر چھوٹوں کو آپ اور بڑوں کو حضور کہہ کر نوازا جاتا تھا۔ جہاں لوگ ''خدائے بزرگاں گرفتن خطا است'' (یعنی بزرگوں کی غلطیوں کی نشاندہی بھی زبردست غلطی ہے) پر پورا ماحول سختی سے عمل پیرا تھا۔ ایسے میں وامق کا اپنے ماحول سے بغاوت کر کے عوام الناس سے قریب ہونا، ان کی مزاج پُرسی کرنا ان کے دکھ درد میں شریک ہونا ان کے مسائل کو سمجھنا اور ان کی مدد کرنا آسان کام نہ تھا۔ مگر سماج کبھی کبھی اس روپ کو بہروپ سمجھنے لگتا ہے اس کو یقین نہیں ہوتا کہ روایات سے ہٹ کر کوئی آدمی کیسے سوچ سکتا ہے سوچ ہی نہیں بلکہ عملی اقدام بھی کر سکتا ہے اس سلسلے میں خود وامق صاحب اپنا تجربہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''ہمارے ساتھی (جو زیادہ تر سینیر تھے) کہا کرتے تھے ارے بھائی! جانتا ہوں یہ لوگ جونپور کے زمیندار خاندان کے ہیں ..... یہ لوگ اور کمیونسٹ تحریک ..... یہ اور ترقی پسند تحریک ..... یہ کچھ نہیں ..... یہ عین وقت پر دھوکہ دینے والے ہیں۔ انھیں کسی خفیہ میٹنگ مین نہیں بلانا چاہیئے۔ یہ کسانوں میں سے نہیں ہیں۔ یہ مزدوروں کے خاندان کا لڑکا نہیں ہے۔ اس لئے اس کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے ان باتوں سے بڑی تکلیف ہوتی ..... بھوت بن کر ان کا خیال میرے ذہن پر رہا اور ایک طریقے سے میرے اداروں میں۔ انقلابی اداروں میں وہ ہمیشہ ایک قسم کی رہنمائی کرتا رہا کہ خبردار تم سے کوئی غلطی نہ ہونے پائے ..... فائدہ مند ثابت ہوئی یہ بات مجھ پر اللہ کا کرم ہے کہ آج تک تحریک یا سیاسی معاملات میں، دانستہ کوئی غلطی نہیں ہوئی۔''

(وامق کی پرسنل ڈائری سے)

دیکھنے کی بات ہے کہ جب خود اپنے ہی بداعتمادی کا کھل کر اظہار کریں انگلی اٹھائیں اور طنز سے کام لیں تو اچھوں اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ اکادہ انتشار و بغاوت کا سبب بن جاتا ہے مگر وامق کے ذہن میں یہ بات آئی تک نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے اصولوں وعقیدے کو گلے سے لگائے ہوئے تھے۔ اور اس پر کبھی اور کسی سے بھی سمجھوتہ نہیں کیا یہ ان کی فطرت صالحہ کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

انسان حالات زندگی اور اس کے نشیب وفراز سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جیسے کوئی جاندار موسم کے تغیر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زندگی کے تغیرات کا اثر انسان کے دل ودماغ پر بھی پڑتا ہے اور اسی حساب سے وہ اپنی سوچ کو بدلنے پر مجبور پاتا ہے اور جب قلب وسوچ نئی فکر وسوچ سے متاثر ہوتے ہیں تو اس کا اثر اس کے ذہنی نشوونما اس کی فکر اس کے فن اور اس کی تخلیق میں صاف دیکھا جاسکتا ہے اور جید دانشور ادیب وشاعر کچھ زیادہ ہی ذکی الحس ہوتے ہیں اس لئے بدلے ہوئے حالات سے وہ سب سے زیادہ اور سب سے پہلے متاثر ہوتے ہیں۔ وامق کی ذاتی ڈائری کا یہ اقتباس بھی ان کے حساس ذہن کی عکاسی کرتا ہے

> ''میری ذات سے وابستہ دو حادثوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک یہ کہ میں ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوا کہ زندگی بھر میں اپنے وجود کا خمیازہ بھگتا کروں دوسرا حادثہ ۱۹۴۰ء میں یہ ہوا کہ میں ایک دم شاعر بن گیا۔''

(وامق کی پرسنل ڈائری)

۱۹۴۰ء یعنی وامق کی بھرپور جوانی کا زمانہ اور اس کے تقاضے انھیں روایاتی شاعری یعنی رومانی وعشقیہ شاعری کے لب ولہجہ مجبور کررہے تو دوسری طرف ترقی پسند تحریک، جنگ، جاگیردارانہ نظام کے مظالم اور سرمایہ دارانہ نظام کی لوٹ کھسوٹ کے تقاضے ہی کچھ اور تھے جس سے ہر حساس آدمی بلبلا اٹھا۔ پھر وامق کیسے بچ پاتے یہ صحیح ہے کہ اوائل میں انھوں نے اپنے کلام میں میر، غالب،

داغ، فانی، جگر کی روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر اپنے کو برقرار نہ رکھ سکے اور جلد ہی اس ڈگر سے مراجعت اختیار کی ابتدائی دور کی غزلوں کے کچھ نمونے پیش ہیں ۔

عقدہ نہ آج تک کھلا چشم مست کا
ساغر میں ہے شراب کہ ساغر شراب میں
وامق برائے کیف بدلتا ہوں کروٹیں
کچھ زندگی کا لطف تو ہے اضطراب میں

توجہ کچھ ان کی ادھر ہو رہی ہے
ہماری نظر معتبر ہو رہی ہے
یہ کہہ کہہ کے شمعیں بجھاتا ہے وامق
وہ کل آئیں گے اب سحر ہو رہی ہے

کھویا کھویا سا پا کے ہمیں وہ دل کی باتیں جان گئے
اور ان کا تجاہل دیکھتے ہی ہم ان کی نظر پہچان گئے
پیمانہ گر جھنکار ہوئی خاموش فضائیں گونج گئیں
دل ٹوٹتے ہی اک آہ جو کی سب راز محبت جان گئے

شباب اس کا چھلکتی شباب کا ساغر
خطاب اس کا بھودا آبشار کی جیسے
جو دور سے اسے دیکھو تو چاند جیسا لگے

قریب جاؤ تو پتھر دکھائی دیتا ہے

وعدہ خلافی کر کے صفائی نہ دیجئے
اس شرط پر ہمیں سب ہجراں قبول ہے
نگاہیں تاڑ لیتی ہیں محبت کی اداؤں کو

چھپانے سے زمانے بھر میں شہرت اور ہوتی ہے
یہ مانا حسن کی فطرت بہت نازک ہے اے وامقؔ
مزاج عشق کی لیکن نزاکت اور ہوتی ہے

لیکن شاعر نے ابھی وادیٔ حسن وعشق میں قدم رکھا ہی تھا کہ اسے جنگ کی ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑا اس نے اپنی آنکھوں سے جا کر قحط بنگال کا مشاہدہ کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ قحط کی تباہ کاری میں قدرت کا کم، جابروں، سودخوروں، جاگیرداروں اور مہاجنوں کا زیادہ ہاتھ ہے۔ اس نے جاگیردارانہ نظام کے تحت دبے کچلے لاکھوں انسانوں کو بلکتے اور سسکتے دیکھا تو اپنے کرب کو دبا نہیں سکے اور بے اختیار کہہ اٹھے ؎

وہ عہد مسرت کی باتیں وہ وقت سہانا بھول گئے
جب سے غم دوراں یاد آیا سب لطف زمانہ بھول گئے
اندوہ کی ماری دنیا میں کچھ اپنی زباں سے کہہ نہ سکے
اوروں کے فسانے سن سن کر ہم اپنا فسانہ بھول گئے

اس احساس کے بعد تو وامق ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں تھے۔ ترقی پسند تحریک پر کی گئی تنقیدوں اور تبصروں پر بہت کچھ لکھا گیا۔ اور شاید آئندہ بھی لکھا جائے (جس کا ذکر وامق نے

اپنی نظم مداوا میں کیا ہے) مگر اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ عوامی مسائل، جبر واستبداد، جاگیر دارانہ نظام، سرمایہ داری، فرقہ پرستی، اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں نے بنا کسی مصلحت اور مصالحت کے جس طرح مورچہ سنبھالا جس طرح سامراج سے ٹکر لی جانی مالی ہر طرح کی قربانیاں دیں قید و بند کی سختیاں جھیلیں اس میں جرأت لگن یا اخلاص کی کمی تھی۔ اس دور کے ادیبوں نے ہر محاذ پر ان کو برائیوں کے خلاف مخلصانہ مورچہ کھول رکھا تھا۔ وامق بھی پیش پیش تھے ایک مظلوم و مجبور اگر بغاوت کرتا ہے تو اس کی مجبوری پر محمول ہوگی۔ مگر وامق خود جاگیردارانہ نظام کے پروردہ تھے مگر جس طرح سے انھوں نے خود اس نظام سے بغاوت کر کے اپنی عیش وعشرت سے بھرپور زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر کے اس کے اپنے عمل اپنی زبان اپنے قلم سے اظہار نفرت کا ثبوت دیا وہ بلا شبہ قابل تحسین اور قول وعمل میں یکسانیت کی دلیل تھی۔ وہ ادب برائے زندگی اور ''جیو اور جینے دو'' کے فلسفے پر زندگی بھر عمل پیرا رہے۔ وامق نے خود اپنے نظریہ فن کی عکاسی اپنی تحریر میں اس طرح کی ہے۔

> ''ادب کو انسان دوستی کا روشن مینارہ ہونا چاہیئے قومی یکجہتی، ملکی سلیت اور آزادی ضمیر کا آئینہ دار ہونا چاہیئے اور حسن محبت کا لالہ زار جو ادیب باطل اور قاتل سے نفرت نہیں کرسکتا (خواہ اس کا مرکز اندرونی ہو یا بیرونی) وہ حسن وعشق سے نہ محبت کرسکتا ہے نہ آزادی ملک وقوم اس کی نظر میں کوئی حیثیت رکھتی ہے تو اس کی تخلیقات قابل اعتبار نہیں''[1]

اور اپنے اس دعوے کی تائید انھوں نے اپنی نظم ''فن'' میں بھی کی ہے ؎

سوال جب کبھی اٹھا ہے مقصد حیات کا
تو حرف ورنگ وسنگ میں جواب بن گیا ہوں میں

---

[1] مقدمہ شب درد ص ۱۴

جہاں بھی حق کی بات دب گئی ہے شور ظلم میں
اٹھا لیا ہے میں نے اپنے سر پہ آسمان کو
جہاں کہیں عوام کا سوال بن گیا ہوں میں
تو جابروں کی جان کا وبال بن گیا ہوں میں
میں فن ہوں میری انگلیاں ہیں زندگی کی نبض پر
قدم مرا زمین پر تو کائنات پر نظر

وامق ترقی پسند تحریک میں دل و جان سے شریک تھے اور بقول علی سردار جعفری کے

''ترقی پسند تحریک میں شریک ہونے کی ایک شرط ہے جس پر تمام مصنفین متفق ہیں اور وہ ہے ادب میں عوامی زندگی کی ترجمانی کرنا۔'' [۱]

عوامی زندگی سے مراد اشترا کی رجحان کی حمایت ہے اور اشترا کی رجحان یا نظریہ کا مطلب ہے مختلف طبقاتی کشمکش کا خاتمہ جیو اور جینے دو کا زریں اصول غریب، مزدور، دبے کچلے اور پسماندہ طبقے کی ہمنوائی اور بلا شبہ وامق کا نظریہ حیات بھی اشترا کی تھا۔ انھوں نے فاشزم کے خلاف آواز اٹھائی، وہ ایک بہتر نظم حیات اور اچھے معاشرے کے لئے آخری سانس تک اشترا کی اصولوں کی پیروی کرتے رہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ان کی ہر صنف خواہ غزل ہو یا نظم، گیت ہو یا لوک گیت ہو یا خالص پوربی زبان میں لکھے گئے ان کے بجرے وغیرہ سب میں اسی نظریے کی پرزور تائید ملتی ہے۔ بقول عبدالرحمٰن بجنوری

''شاعری انکشاف حیات ہے جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔''

یہ بات ادیب و شاعر کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے کہ اپنی بات اور اپنے دلی جذبات کا اظہار

---

[۱] علی سردار جعفری۔ ترقی پسند ادب ص ۲۷

کس اسلوب و انداز سے کرتا ہے کہ اس کی بات سماج کے ہر طبقے میں دور دور تک جانی و پہچانی جائے اس کے لئے انھوں نے نیا اسلوب اور نیا انداز بیان اختیار کیا جسے عوامی شاعری یا عوامی ادب کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ عوامی شاعر کسے کہتے ہیں یا کسے کہا جا سکتا ہے اس کی تشریح خود وامق نے اپنے ایک مضمون ''عوامی شاعری'' میں اس طرح کیا ہے :

> ''ہر دور میں دوسری چیزوں کی طرح شاعری کا بھی معیار اور اس کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ موجودہ دور زندگی کا جمہوری دور ہے جو عوامی نہیں کہی جا سکتی جس سے عوام کو فائدہ نہ پہنچ سکے۔ یا جس کو عوام نہ اپنا سکیں۔ اس لئے آج کے معیار پر ہی اصلی ترقی پسند شاعری ہے جو عوامی شاعری کہی جا سکے اور عوامی شاعری کی تشریح وہ اس طرح کرتے ہیں کہ ''عوامی شاعری وہی شاعری ہے جس کو عوام سمجھ سکیں جس کو عوام گا سکیں عوامی شاعری اس وقت تک نہیں کہی جا سکتی جب تک اس میں عوامی زبان کا استعمال ایک تحریک کی صورت میں نہ آ جائے آج عوام کے متعلق شعر کہنے سے زیادہ عوام کے لئے شعر کہنا ضروری اور اہم ہے'' [۱]

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک سے پہلے ہی عوامی یا اشتراکی میلانات کا ظہور ہو چکا تھا۔ علامہ اقبال اور جوش جیسے شاعروں نے بھی مزدور اور کسان کے موضوعات پر بڑی اچھی نظمیں کہی ہیں مگر بقول وامق۔ اسے کسی پہلو سے بھی عوامی شاعری نہیں کہا جا سکتا لیکن اسے اتنا ضرور ہوا کہ ترقی پسند شاعروں کا بہت بڑا حصہ عوامی مسائل سے متاثر ہو کر عوامی موضوعات پر طبع آزمائی کرنے جس میں فیض، جوش، مخدوم، مجاز، ساحر، سردار، وامق، وقار، سلام وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ گو فیض سے لے کر سردار و ساحر تک نے عوامی مسائل سے متاثر ہو کر فاختہ کی آواز، فتنۂ خانقاہ،

---

[۱] وامق جونپوری۔ عوامی شاعری۔ شاہراہ جولائی اگست ۵۲ء

رات اور ریل آوارہ، جنگ آزادی، سیاسی لیڈر کے نام، ہاتھوں کا ترانہ اور چکلے جیسی نظمیں کہیں اور خوب کہیں اور بلاشبہہ اردو کی نظیمہ شاعری کا انمول خزانہ ہیں مگر انہیں لوک شاعری کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن وامقؔ، مطلبی، وقار سلامؔ نے بیشک عوام کے مسائل پر اور عوام کے لئے بہت کچھ لکھا۔ جس میں وامقؔ سرفہرست ہیں اور بلاشبہ ترقی پسند تحریک کے دور عروج میں عوامی سطح پر جو مقبولیت وامق کی نظموں کو ملی وہ کسی ترقی پسند شاعر کے حصے میں نہ آئی۔ اس زمانے میں بھوکھا ہے بنگال، زمین، مینا بازار، مزدور کا کورس، بول دے ساتھی بول، اور پنجاب جیسی نظمیں عوام کی زبانوں پر گونج رہی تھیں۔

یہی نہیں وامقؔ نے عوامی مسائل پر اور عوام کے لئے عوام کی زبان میں بھی بہت کچھ لکھا ہے جسے ہم عوامی یا لوک شاعری یا لوک گیت کہہ سکتے ہیں۔ ان لوک گیتوں میں بھی دلی کیفیات بیان ہوئی ہیں جو ان کی شائستہ وشگفتہ لہجوں کی نظموں میں سنائی دیتی ہے۔ عوامی لب ولہجہ میں ان کی نظموں اور گیتوں کو بھی دیکھتے چلیں جس سے ان کے جذبات واحساسات ونظریات ونظریۂ فن کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ چاہت، لگاؤ اور جذبۂ محبت سے بھرپور حسب ذیل گیت کے بند ہیں

اب تو آجا کھیون ہار
من کی نیا ڈوبت جائے
دیت لکھنی اگنی برسائے
پریم ندی ہچکولے کھائے
کون لگائے پار اب تو آجا کھیون ہار
بیچ بھنور، برہا کے جو پہنچ
سارے جتن میں کر کے ہار
سانس چلت ہے اکھڑی اکھڑی

ٹوٹ چلا سنسار اب تو آ جا کھیون ہار

ہولے ہولے میگھا برسے

بجلی چمکے جیرا ترسے

دور پری ہوں تو رے نگر سے

پردیسی کا پیار اب تو آ جا کھیون ہار

بیچ بھنور ، برہا کے جو پہنچ

سارے جتن میں کر کے ہار

سانس چلت ہے اکھڑی اکھڑی

ٹوٹ چلا نیوا داب تو آ جا کھیون ہار

بیٹھی ہوں میں آس لگائے

مو کو کوئی بات بھائے

کون سنے اور کون سنائے

پایل کی جھنکار - اب تو آ جا کھیون ہار

آزادی سے پہلے زمینداروں ، جاگیرداروں ، سرمایہ داروں کے ہاتھوں عوام کا بدترین استحصال اور اس کے خوف ناک مناظر کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا تھا۔ اس پر ان کا تلملانا ان کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ ردعمل کے طور پر ان کے گیت کے یہ بند پیش ہیں۔

راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول

کب تک یوں ہی بیٹھے رہنا بول رے ساتھی بول

جنتا جاگی بھارت جاگا جاگا سب سنسار

بول لے ساتھی بول

پتکھے گھاؤ اٹھانے والے کھینچے ہیں تلوار

بھود بھئی یو پھائن لاگی سینے ڈانوا ڈول

راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول

بول رے ساتھی بول

ہاتھی آیا ہاتھی آیا گاؤں میں اٹھا شور

ناچ سنے آ پہنچا تو کوا نکلا مور

راج محل میں آگ لگی ہے پنچھی پنجرا کھول

بول رے ساتھی بول

ہندوستان کو آزادی تو ملی مگر خون سے لت پت، ملک تقسیم ہوگیا، فرقہ واریت کا بھوت ننگا ناچ رہا تھا پوری انسانیت کراہ رہی تھی اور یہ حادثہ وامق کی بھرپور جوانی میں ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا ایسے میں ان کا درد الفاظ کے سانچے میں اس طرح ڈھل گیا ہے۔ ؎

جلتے ہوئے آنچل کو لے کر

ناری نکلی گھر کے باہر

بھولے بھولے پیارے پیارے

بچے ماں کو ڈھونڈ رہے تھے

دولہن بھی گھونگھٹ کو سنبھالے

خون میں دوبے کان کے بالے

سمجھے ہوئے اپنے کو سہاگن

کا کی بیاہی آج ابھاگن

ڈھونگ یہ پونجی پیوں کا تھا　　کھیل یہ گورے نبیوں کا تھا
ہندو مسلم سکھ عیسائی　　کہنے کو تھے بھائی بھائی
کس کو پروا آگ لگی تھی　　بندا دے کی سب کو پڑی تھی
ملک کی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر　　رہ گئے حصے تجرے ہو کر

اس ہوا دے کہ دنیا میں　　فرق رہا بندے نہ خدا میں
وہ بھی بے گھر، یہ بھی بے گھر　　وہ بھی گھر گھر یہ بھی در در

جنگ کا انجام کتنا بھیانک ہوتا ہے اس کی تباہ کاریوں کا حال پہلی جنگ عظیم کے بعد بزرگوں سے سنا تھا اور اخباروں و کتابوں میں پڑھا تھا اور دوسری جنگ عظیم کے بھیانک مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے وہ جنگ کے خلاف یوں نعرہ زن ہیں۔ وامق بھی جنگ کے حامیوں کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔

جنگ کی ہے ہڑتال
پول لڑائی کی کھولو تو پونجی نیز بہائے
ہائیڈروجن بم کی گرج سے ڈالو دل بہلائے
امن کی شکن سے جنتا کا ہردے مالا مال
جنگ کی ہے ہڑتال
امن کے آگے گورے، پیلے، کالے سب ہیں ایک
امن غلامی کے جوئے کو یک دم دیگا پھینک
کوئی بھلا کیا کھینچ سکے گا تب جنتی کی کھال
جنگ کی ہے ہڑتال

لوک گیتوں کے علاوہ اردو کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ''[illegible]''، ''جرس''، ''شب چراغ'' اور سفر نا تمام'' کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے اس میں کہیں بھی وامق اپنے نظریاتی اصولوں سے پیچھے ہٹتے نظر نہیں آتے۔ انھوں نے جو دیکھا جو محسوس کیا۔ اس کا ببانگ دہل اعلان کیا۔ فرقہ وارانہ ہلاکت خیزیوں کے خلاف بغیر کسی لاک لپیٹ کے اپنی ایک نظم ''ہم بزدل ہیں'' میں اس طرح نعرہ زن ہیں:

یہ رقص وشرر، نفرت کا شجر
بے برگ وثمر، پیاسوں کا سفر
صحرا صحرا، دریا، دریا
لمحہ لمحہ، صدیاں صدیاں
رنگیں ہے خون انساں سے
تخریب وطن کی تحریکیں
زندہ ہیں ہمارے عصیاں سے
ہم کمزور کے قاتل ہیں
ہم بزدل ہیں
ہم خون کے پیاسے جان کے بھوکے
رقص شرر کے ماہر ہیں
نفرت کے چلن میں شاطر ہیں
ہم سوکھے شجر کے مالی ہیں
ان زخمی شاخوں کو دیکھو
جو برگ وثمر سے خالی ہیں

ہم وحشی درندے اپنے خون آلود نکیلے پنجوں سے

تاریخ وطن لکھ جائیں گے

یہ جبڑے ہمارے خون شہیداں پینے کے عادی ہیں

یہ ہاتھ ہمارے خون غزالاں کے بہنے میں شامل ہیں

ہم بزدل ہیں

کرتے ہیں سہاگن کو بیوہ

کرتے ہیں غیرت کو رسوا

بچوں کو یتیم اور ماؤں کی گودی کو اجاڑا کرتے ہیں

ہم بام و در کے نقشوں کو شعلوں سے بگاڑا کرتے ہیں

تصویر حنا و صندل کو ہم گولیوں سے چھلنی چھلنی کر دیتے ہیں

ہم لالہ و نرگس کا دامن انگاروں سے بھر دیتے ہیں

انراں سے عداوت ہے ہم کو

انسان سے ہم کو نفرت ہے

گیتا کو جلا دیتے ہیں ہم

بھگوان سے ہم کو نفرت ہے

گرو بانی کے ہم دشمن ہیں

قرآن سے ہم کو نفرت ہے

اس قوم کے حصے بخرے کو ہم گھن بن کے کھا جائیں گے

ہم زہر کی صورت قوم کی عقل و دانش پر چھا جائیں گے

ہم پونجی پتیوں کے چیلے

ہم گندی مٹی کے ڈھیلے

جو مارے مارے پھرتے ہیں

عیسائی نہیں مسلم بھی نہیں ہم کچھ بھی نہیں

ہم بزدل ہیں

ہم اپنے پرانے جنگل کو پھر واپس جانا چاہتے ہیں

ان شہروں سے نفرت ہے ہمیں

یہ مسجد، مندر گرودارے

یہ گرجا گھر یہ مینارے

ان سب کو ملا کر مٹی میں

ہم اپنے اندھرے غاروں میں بونوں کی طرح گھس جائیں گے

وہ خواہ گرو گوبند جی ہوں

یا چاہے لکشمی بائی ہوں

وہ خوہ نہرو ہوں یا گاندھی جی سالا روطن

یا چاہے اندرا گاندھی ہوں

سقراط ہوں یا ابن مریم

یا ہوں وہ حسین تشنہ دہن

وہ لوگ ہمیں مل جائیں اگر

پھر قتل انہیں ہم کر دیں گے

ہم بزدل ہیں

متعصب، فرقہ پرست، سماج دشمن غنڈے اور جرائم پیشہ افراد کی وامق نے کتنی صحیح عکاسی

کی ہے شاعران کی نفسیات سے بھی بخوبی واقف ہے کہ یہ بے ضمیر افراد اپنے سے کمزوروں کے لئے جتنے شیر دکھائی دیتے ہیں اپنے سے زبردستوں کے سامنے اتنے ہی بھیگی بلی نظر آتے ہیں۔ اسی لئے شاعر کے ''دور سخت حکومت'' کے سوال پر ان کو اپنا انجام یاد آتا ہی انکا لہجہ اس طرح بدل جاتا ہے۔

نا بابا

سختی سے ہمیں ڈر لگتا ہے

ہم بزدل ہیں

شاعر کے وثوق اور اس کے فنکارانہ انداز بیان نے نظم کو اور حسین بنا دیا اور خورشید الاسلام کی اس بات میں کتنی سچائی ہے'' کہ شاعری میں وثوق یا تو تجربہ سے پیدا ہوتا ورنہ پھر صناعی سے پیدا کیا جا سکتا ہے'' [1]

اور وامق کی یہ نظم ان کے اپنے تجربے اور ان کے اپنے فن صناعی کی بہترین مثال کہی جانے کے لائق ہے۔

ویسے تو وامق نے اپنی شاعری کا آغاز رومانی اور انقلابی غزلوں سے کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ ان کی شاعری، جذبہ، شعور اور وجدان کی شاعری بن گئی۔ سماج کو بدلنے اور معاشرے کی نو تعمیر کا ایک جذبہ ان کی شاعری میں کروٹ بدلتا رہا ہے لیکن نہ تو ان کا انداز بیان خطیبانہ ہے اور نہ تو ان کی شاعری کی فضا میں گھن گرج ہے۔ ان کے لہجے میں ایک پر وقار ٹھہراؤ ہے۔ سمندر کا سا ٹھہراؤ جس کی آغوش میں نہ جانے کتنے طوفان پلتے رہتے ہیں۔ وامق کے یہاں انقلاب کے تصور میں بھی ڈر، خوف، ہراس، قتل، خون اور غارت گری نہیں ہے مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ہے ''گیت بھینکر'' لیکن عنوان کے مطابقت سے نظم میں دہشت پسندی کے عناصر حاوی نہیں ہیں ہاں وجود میں کروٹیں لیتے ہوئے طوفان کی عکاسی ضرور ملتی ہے

---

[1] ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ تنقیدیں ص ۳۰۷

پھر اٹھا طوفان

رستہ ہے انجان

مانجھی ہے حیران

سینون میں ہیجان- پھر اٹھا طوفان

جینا ہے جنجال

دیش بنا کنگال

ہر بھومی بنگال

ہر بستی ویران پھر اٹھا طوفان

تلواروں پر ہات

جھگڑے کی ہر بات

یہ اندھیاری رات

بھوت اگن، شیطان- پھر اٹھا طوفان

کب تک دیپک راگ

گھر میں لگی ہے آگ

پھوٹ گئے سب بھاگ

ہوش میں آ نادان پھر اٹھا طوفان

وامقؔ کے یہاں انقلاب کے تصور میں ایک پُرعزم اور بلند حوصلہ انسان ہے جو حالات سے ہراساں نہیں ہے اور جو جہد مسلسل کی تلقین کرتا ہے

طوفانِ انقلاب کی ہر موج سر بلند

پہلو میں ہے بلندیٔ ساحل لئے ہوئے

ہم رہروان شوق کے دیکھو تو حوصلے

اک اک قدم ہے، قربت منزل لئے ہوئے

وامقؔ کے یہاں فن کا تصور نہایت اعلیٰ وارفع ہے وہ فن کو اک عمر کی ریاضت کی منزل سمجھتے ہیں۔

دنیا ہے کہ ہر لمحہ کی قیمت مانگے

اور فن ہے کہ اک عمر کی مدت مانگے

وامقؔ ادب کو نظریات کے پروپیگنڈے کا ایک آلۂ کار مانتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نعرے بازی بھی ہے لیکن انھیں نعرے لگانے کا سلیقہ آتا ہے وہ اپنے نعروں کو معیار سے گرنے نہیں دیتے ہیں پسماندہ طبقے کی غربت، اس کے اوپر ظلم، استحصال، ناانصافی اور عدم مساوات کے خلاف انھوں نے احتجاج کیا ہے اور امن ومساوات کا نعرہ لگایا ہے لیکن ان کے نعرے کا انداز نہایت شگفتہ ہے ان کے یہاں ''فریاد'' کی بھی ''لے'' ہے۔

تم نے سوکھے ہوئے بیلے بھی کبھی سونگھے ہیں

ان کو مسلا نہ کرو

کتنی آزردہ، مگر بھینی مہک دیتے ہیں

ان کو پھینکا نہ کرو

غم سے کمھلائے ہوئے چہروں کو سمجھا بھی کرو

صرف دیکھا نہ کرو

دل میں رستے ہوئے زخموں کا مداوا بھی کرو

صرف چھیڑا نہ کرو

(سوکھے ہوئے بیلے)

اس طرح یہ خوبصورت نظم نعرے اور شکایت سے لبریز ہے لیکن بات کہنے کے فن نے نظم کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ اور نظم نعرے بازی کے الزام سے بری ہوگئی ہے۔

وامق کی ایک مشہور نظم مینا بازار ہے جس کو مغربی ادب کی پیروی میں اردو کا من حیث الصنف پہلا (Satire) سیٹائر کہنا چاہئے اور ادب میں ایک اضافہ۔ یہ نظم سماج میں ان ٹاٹ باہر صنف نازک کی زندگیوں پر ایک طنز ہے جن کو سماج نے خود جنم دیا اور خود ان کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ اس نظم کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے یہ بات کہہ دینا بے جا نہیں کہ ترقی پسند ادباء پر فحش نگاری کا بھی الزام عائد کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کا نام بار بار لیا گیا ہے۔ دراصل ان ادیبوں کی تخلیقات، سماج کی ان ناہمواریوں، ان رسوم و قیود پر زبردست غم و غصہ اور نفرت کا اظہار ہیں جو دنیا میں ترقی، سماجی خوشحالی اور معاشرے کے امن و سکون میں زبردست رکاوٹ بنی ہیں۔ یہ جنسی بے راہ روی کا مسئلہ بھوک اور غربت سے عبارت رہا ہے۔

منٹو کے سلسلے میں فحش نگاری کی بات جب کافی بڑھی تو انھوں نے بڑی صفائی سے یہ بات کہہ دی کی وہ وقت کی تلخ سچائیوں کو حالات کی سنگین حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں انھوں نے لکھا تھا

''اگر ویشیا کا ذکر فحش ہے، تو اس کا وجود بھی فحش ہے اگر اس کا ذکر ممنوع ہے تو اس کا پیشہ بھی ممنوع ہونا چاہیئے۔ ویشیا کو مٹائیے اس کا ذکر خود بخود مٹ جائے گا،، [1]

وامق کا قلم ''تھکے ہوئے نظام'' کے اس المیے پر جراحتوں سے چور ہے اور ان کے دل میں بے پناہ کرب ہے۔ شام کے اس منظر میں جس کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں۔

درندے چڑھتے آرہے ہیں مرگھٹوں کی راہ میں
سیاہی بڑھتی جارہی ہے فکر میں نگاہ میں

---

[1] مجھے کچھ کہنا ہے۔ منٹو کے مضامین

کہیں کہیں ان کی ''لے'' تیز ہوگئی ہے لیکن پھر بھی انھوں نے اپنے جذبات قابو میں رکھے ہیں اور ان کی آواز چیخ نہیں بن سکی ہے۔ شاید اس لئے بھی وامقؔ کو نالہ وشیون پسند بھی نہیں ہے جو ان کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

نالہ کرنا مرا دستور نہیں
آسماں دُور نہ بہت دور نہیں

دراصل وامق کے مزاج میں غیرت زیادہ جرأت، حسن اور سلیقہ مندی ہے۔ وہ بات کے لئے ہمیشہ ایک حسین پیرایۂ اظہار چاہتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کے لئے اپنی ایک لغت تیار کی ہے جس میں ان کے تصورفن کے ساتھ ان کی طبیعت کے جلال و جمال کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ ان کی لغت کی اجمالی تفسیر یوں ہے۔

شعر ذکرِ بتاں شعر فکر جہاں شعر عطر زباں
شعر ہے اک فسوں، کیا خرد کیا جنوں، اس کے زیر اثر
راستے پُر خطر، ہر قدم اک سفر، زندگی مختصر
شیشۂ دل میں بس، بھر دے یادوں کا رس اے مسیحا نفس
جز ترے شوق کے، اس غم دہر سے، ورنہ کس کو مفر

وامق اپنے لئے ایک راہ اور منزل کا تعین کر کے چلے اور اس پر گامزن رہے ہیں انھوں نے فن کے ساتھ ترقی پسند تحریک کو بھی ہمشہ اپنے گلے سے لگائے رکھا۔ تحریک میں جب تعطل پیدا ہوا اور وہ تشکیک کی منزل میں پھنس گئی یا اس پر جب جمود طاری ہوا تب بھی وامقؔ کی شاعری اس سے منتشر نہیں ہوئی جب وقت کے بدلتے ہوئے رجحان کے ساتھ ہیجانی، جذبات انگیز اور موضوعاتی کلام پیش کرنے والے شعراء کو اپنی تخلیقات کے رنگ وروغن اترتے ہوئے محسوس ہوئے اور ان کے قلم کی روانی رک گئی تو بھی وامق کے یہاں جمود نہیں طاری ہوا۔ گو ''جرس'' کے بعد ان کے مجموعہ

''شب چراغ''مین خاصہ وقفہ ہے لیکن اس کی وجہ ان کا قلم رکھ دینا نہیں تھا بلکہ ان کی دوسری مصروفیات ومشکلات وقدرے لاپروائی رہی ہے۔

وامق نے اوائل میں چند جذبات انگیز نظمیں بھلے لکھی ہوں، لیکن بعد میں انھیں یہ احساس ہوگیا کہ ایسی تخلیقات کی عمر بہت کم ہوتی ہے اور وہ اپنی تاب وتوانائی باقی نہیں رکھ سکتی ہیں۔اس لئے وہ ہیجانی وجذباتی راہوں سے ہٹ کرفن کی راہوں میں چلے آئے اور ایسی شاعری سے اجتناب کرتے رہے ہیں۔

وامقؔ کی نگاہ مغربی ادب کے شہ پاروں پر بھی رہی ہے چنانچہ ادب کی تخلیق میں انھوں نے اکثر مغربی ادب سے اکتساب کیا ہے۔ان کی نظم ''زمین'' میں انگریزی صنف سخن کی اوڈ (Ode) کی سی خصوصیت ملتی ہے۔اسی طرح ''مینا بازار'' کے اسلوب بیان میں (Social Satire) کی کیفیت نظر آتی ہے۔وامق کی نظم ''زمین''''آفرینش''''وقت''اور ایک ادھر کی نظم ''کل عدم، کن فکاں'' وغیرہ کا کینوس نہایت وسیع ہے یہ نظمیں اپنے بیان میں بے پناہ تنوع رکھتی ہیں۔اور تمام تر فنی التزام نے ان نظموں کو کافی خوبصورت بنادیا ہے۔وامقؔ کی نظم ''زمین'' ارتقاء کی ایک کہانی ہے۔لیکن جزئیات سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے نظم کا گیسو کسی محبوبہ کی طرح سنوارا ہے۔

قلب میں ہے ترے آگ، جھرنوں میں ہے تیرا راگ، کھیتوں میں تیرا سہاگ
ذروں میں تیرے چمک، جسم میں تیرے مہک، چہرے پہ تیرے نمک

.....

بطن میں تیرے نہاں، ہر شجر و استخواں، زیب کا سنگ نشاں
قبل تمدن ترا، حال ہی کچھ اور تھا، آندھیوں کا دور تھا
زلزلوں کے کرب میں، آگ بگولا تھی تو، شعلوں کا جھولا تھی تو

.....

آدمی کی ماں بنی، دولت دہقاں بنی، لطف کا ساماں بنی
عاشق مزدور تو ، حامیٔ رنجور تو، مامتا سے چور تو

.....

تجھ پہ اگائے گئے ، گلشن صدر نگ و بو ، کر کے پسینہ لہو
کتنی ہی تہذیبوں کا ، بن گئی گہوارہ تو ، پہلے تھی انگارہ تو

.....

زہرہ ومریخ پر ، سیر کی تیاریاں ، ہورہی ہیں اب یہاں
تیری یہ سب کروٹیں ، ایک نئی دور کو ، دی رہی ہیں دعوتیں
تیرے یہ سب اضطراب ، جلد ہی لانے کو ہیں ،ایک بڑا انقلاب
اے مری پیاری زمیں ، کتنی جواں اور حسیں ، نوع بشر کی امیں

(زمین)

وامق کی ایک نظم ''آفرینش'' ہے اس کا موضوع ، آغاز کی حیرتناکیاں وجود کائنات اور ارتقاء حیات ہے۔اس کا کینوس بھی وسیع ہے اور فنی اعتبار سے یہ نظم کلاسیکی ادب کا نمونہ کہی جاسکتی ہے۔نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

آسماں آسماں
آسماں بیکراں
وسعت بیکراں
رفعتِ بیکراں
شش جہت اک خلا
تا خلا مادہ

مادہ ابتدا

مادہ انتہا

ابتدا کچھ نہیں

انتہا کچھ نہیں

قاعدہ کچھ نہیں

قاعدہ رقص میں

فاصلہ رقص میں

شعلۂ بے اماں

سبب ہے بے گماں

پھٹ گیا جُڑ گیا

ہٹ گیا مڑ گیا

رُک گیا، مل گیا

.....

زلزلے گرمیاں

آتشیں کارواں

دود و کف درد ہاں

آ گیا جھوم کر گرد خورشید کے

چڑھ گیا گھوم کر بام خورشید پر

رُک گیا چوم کر

جام خورشید کو

قلب آتش خیز سے آہیں اٹھیں

ہاتھ پھیلائے ہوئے موجیں اٹھیں

جس طرح بچھڑا ہوا کوئی حبیب

دور سے آئے نظر آتا ہوا

شوق کے طوفان اٹھواتا ہوا

.....

چوٹیاں موجوں کی گولے بن گئیں

اپنے بازو میں جکڑنے کے لئے

جست میں آ کر بگولے بن گئیں

.....

وصال اور ہجر کے تصور کے ساتھ ہی صبح وشام آئے

بہت خم آفتاب چھلکا تو دور میں چند جام آئے

آج بھی اس کائنات کی حیرتناکیاں جاری ہیں:-

یہ دنیا حسن جس کا شہرہ آفاق ہے یہ ہے

وہ رقاصہ جو پرکاری میں اپنی طاق ہے یہ ہے

تغیر اس کی عادت، ارتقا اس کی شریعت ہے

عروج آدم خاکی، تو اس مٹی کی فطرت ہے

ابھی آئیں گے سیارے، کئی اس کی قلمرو میں

ابھی تو کیسے کیسے گل کھلیں گے اس تگ ودو میں

(آفرینش)

حالانکہ وامقؔ کا موضوع فلسفہ نہیں ہے لیکن اپنی اکثر نظموں میں انھوں نے فلسفے کا خشک موضوع اٹھایا ہے ان کی ایک ایسی ہی نظم وقت ہے یہ نظم ہیئت ،مواد، اظہار بیان ،فنی بصیرت اور موضوع کی ہمہ گیریت کے لحاظ سے لفظ ومعنی کا ایک حسین گلدستہ بن گئی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وامقؔ کی نظم ''وقت'' شاعری کی قدروں سے قطع نظر، خود شاعر کی فکری بصیرت اور ذہنی قدروں کو روشناس کراتی ہے۔

یوں اکثر لوگوں نے (جس میں اقبال ایک بڑے مبلغ ہیں) زندگی کو رواں دواں اور جاوداں کہا ہے دراصل یہ تبلیغ حیات کو عزم ویقین ،حرکت وعمل سے بہرہ ور کرتی ہے ورنہ تلخ حقیقت تو یہی ہے کہ زندگی کی ناؤ، وقت کے سمندر میں لاکھ بچا بچا کر چلانے کے باوجود موت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ وقت کے سیل رواں میں انسان کا وجود ایک تنکا سا ہے جو نہ معلوم کب اور کہاں گم ہو کر رہ جائے۔ اسلئے کائنات میں صرف وقت کو ہی ثبات ہے وقت کا سیل رواں ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا وقت کی ابدیت کے پرچم تلے زندگی ''جہد مسلسل'' پر آمادہ ہے اور یہی جہد مسلسل کا دھارا، وقت کے بیکراں دھارے میں مل کر زندگی کی جوئے کم آب ''کو ایک ''بحر بیکراں'' بنا دیتا ہے تغیر وقت کی شریعت اور انقلاب اس کا ایمان ہے لیکن وقت کا یہ دستور زندگی کو زندگی کی طرف پہنچا دینے کیلئے ہے ورنہ وقت خود کسی بھی پیچ وخم سے بے نیاز گزرتا جاتا ہے اپنی انتہاؤں کی منزل کی طرف وقت کا مسافر ازل سے روانہ ہوا اور تا ابد چلتا رہے گا

زندگی اک متحرک جادہ
ارتقاء جس کا مدار
باد وآب وگل ونار
زندگی جہد مسلسل پہ سدا آمادہ
زندگی اک متحرک جادہ

وقت ایک جوئے رواں

بے کراں، سیل گراں

وقت کا کوئی کنارہ ہے نہ اس کی کوئی تھاہ

اس کی ہر موج ہزاروں صدیاں

جزر و مد اس کے تواریخ جہانِ گزراں

وقت رفتار ہے لمحات کا ایک دھارا ہے

وقت دلدار و جہاں دار و جہاں آراء ہے

.....

وقت ادراک و کمالات نظر دیتا ہے

پائے افکار کو توفیق سفر دیتا ہے

.....

وقت کی سانس ہے طوفاں کا آہنگ خرام

اس کی ہر جنبش مژگاں ہے تغیر کا پیام

اتفاقات کھلونے اس کے

حادثات دو جہاں وقت کے ہیں باز یچے

انقلاب اس کا مزاج

وقت ہر غم کا علاج

.....

ابدیت کے ساتھ وقت کی ایک اہم خصوصیت اس کی انتہاؤں کا سلسلہ (Infinity) ہے

ایلیٹ نے ان باتوں کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

حال و ماضی ، غالباً دونوں مستقبل کے اندر موجود ہیں اور مستقبل ماضی کے بطن میں ہے ، یہ بات بالکل سچ ہے کہ وقت سے کبھی مفر نہیں وامق کہتے ہیں ۔

وقت محدود حصارات نہیں

وقت پابند خیالات نہیں

نہ کوئی شام ہے اس کی ، نہ کوئی اس کی سحر

کوئی خالی نہیں اس سے ، نہ خلاء اور نہ ہوا

نہ کوئی دشت ، نہ در

وقت ہر شے یہ محیط

ایک آغوش بسیط

.....

وقت ایک ٹھوس حقیقت ہے نگاہوں سے پرے

ایک گراں مایہ لطافت ہے گمانوں سے پرے

سنگ و آہن کے سمندر میں تلاطم سا ہے

اک عجب سکتہ کا عالم ہے ، یہ عقدہ کیا ہے

.....

وقت دیرینہ و لافانی ہے

وقت یکتائی میں لاثانی ہے

جب نہ تھا کچھ تو ، فقط تھا یہ وقت

اور جب کچھ نہ رہے گا تو رہے گا یہ وقت

ابتداء کوئی نہ اس کی ، نہ کوئی اس کا عدم

ایک وحدت جو کبھی بیش نہ کم

اس کا خالق نہیں کوئی، نہ کوئی اس بڑا

یہی شاید ہے خدا !

وقت میں عظیم امکانات پوشیدہ ہیں ۔ وامقؔ نے وقت کی دارائی وگیرائی کا بیان بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے ۔ پوری نظم مذہبی عقائد سے الگ ہو کر، فلسفہ دلا جک کی روشنی میں ان کے فن کا بہترین نمونہ ہے ۔

اس کے امکان میں اعداد کی پنہائی ہے

اس کی قدرت میں قیامت کی توانائی ہے

اس میں برنائی ہے، دارائی ہے، گیرائی ہے

وقت بیگانۂ دستور ہے ، ہر جائی ہے

کبھی جلوت میں نہاں اور کبھی خلوت میں عیاں

خود تماشہ بھی ہے اور خود ہی تماشائی ہے

(وقت)

یہ ساری تعریفیں خدا کے لئے بھی ہیں اس لئے عقلی دلائل کی روشنی میں ''وقت'' کی پذیرائی ہوتی ہے ۔

وامقؔ کے مزاج کی طرح، ان کی نظموں کی فضا بھی اکثر گرم ہے ۔ ان کی اکثر نظموں میں بے ساختگی بھلے ہی نہ ہو، لیکن جرأت تقدیر اور گرمیٔ گفتار ضرور ہے ۔ ان کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ تلخ ترین بات اور تیز وتند لہجے میں بھی فن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا اور یہی خوبی ان کے کلام میں ایک لطیف کیفیت پیدا کرتی ہے ۔

آج اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہم مسدود راہوں کے مسافر بن کر نفرت،

بے گانگی، دہشت پسندی فرقہ واریت، علیحدگی پسندی، قتل، خون اور غارت گری کے جس موڑ تک آ پہنچے ہیں، وہاں تک آنے کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ہم نے حیات کے نقوش خود مٹائے ہیں۔ زندگی کے دستور خود فراموش کر دیئے ہیں۔ زندگی کے نقوش سنوارنے سے پہلے کردار کے نقوش سنوارنا اور ابھارنا ناگزیر ہے۔

یہ بات یہاں، بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے، کہ ملک کی آزادی کے بعد جمہوری نظام کے سائے تلے (ہر شعبۂ حیات میں) تعمیر و ترقی کا کارواں، جس قدر تیزی سے آگے بڑھا ہے اسی قدر تیزی سے ملکی، سیاسی، سماجی اور شخصی کردار میں گراوٹ آتی چلی گئی ہے حرص و ہوش، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، قلت، گرانی، خود غرضی اور مفاد اور موقع پرستی کا جیسے ایک سیلاب آیا ہو اور زندگی کے سارے اثاثے کو بہا لے گیا ہو اخلاقی قدریں، بکھریں تو بکھرتی چلی گئی اور ہم نے زندگی کے بکھرتے ہوئے اثاثے کے سمیٹنے کی جستجو بھی کم ہی کی ہے۔ ہم نے زندگی کے المیے کا ماتم تو بہت کیا ہے لیکن اپنے کردار و عمل پر توجہ نہیں کی ہے حالات کی کسمپرسی نے اکثر قلم کی گردش مایوسی کی سمت موڑ دی ہے لیکن وامقؔ اس منزل میں بھی ثابت قدمی سے گزرے ہیں۔

ابھی تو شفق ظلمتوں میں گھری ہے، طلوع نگار سحر ہو تو کیسے
ابھی تو پریشاں ہے زلف گیتی، مری داستاں مختصر ہو تو کیسے
سکوں کے لئے اس طرف مضطرب ہم، اُدھر بہر تخریب پیکار پیہم
اِدھر فکر تشکیل و تعمیر گلشن، ادھر یہ کہ رقص شرر ہو تو کیسے!

وامقؔ کشمکش حیات سے ہراساں نہیں، ایک پر امن، پر عزم اور خوش آئند مستقبل کی جانب ان کا کاروانِ فن رواں دواں ہے۔ ان کے چہرہ شاعری پر کبھی مایوسی و محرومی کی جھلکیاں نہیں ہیں بلکہ ایک پر وقار سرخوشی ہے جو ان کے حوصلے کا پتہ دیتی ہے۔

یہ اندھیر نگری بہت دور تک ہے، لٹیروں کی بستی بہت دور تک ہے
گذرنا ادھر ہی سے ہے کارواں کو، بغیر تصادم گذر ہو تو کیسے
غرض یہ کہ وامقؔ زمانے کی صورت نہیں آج، تو کل بدل کر رہے گی
جو ہونا ہے وہ آج ہی ہو بھی جاتا، یہ دل چاہتا ہے مگر ہو تو کیسے

وامقؔ کے مزاج کی جرأت مندی، ان کی آواز کی بلندی، ان کے لہجے کی تیزی ان کی طبیعت کا تیکھا پن ان کی شاعری کی فضا میں بھی رچا بسا ہے۔ اوائل کے کلام میں رمز وایما، تشبیہ واستعارے کی کمی ہے، ممکن ہے یہ بات ترقی پسند تحریک کی وابستگی کے زیر اثر آئی ہو، لیکن بعد کے کلام میں ایسی بات نہیں ہے، ان کے کلام کے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ فن کی راہوں میں نئے امکانات کے متلاشی رہے ہیں وہ مستقل مزاجی کے ساتھ فن کی راہوں میں بڑھتے چلے گئے انھوں نے فن کو عبادت کا درجہ دیا اور اس عبادت میں بڑی ریاضت کی ہے۔ اسی لئے وامقؔ کی بعد کی شاعری میں، فن کے گہرے رچاؤ کے ساتھ شعریت، رمزیت، کنائیت، صوری ومعنوی حسن، اور تہہ داریوں کی جھلکیاں ملتی ہین۔ ایسی نکھری ستھری اور بہترین شاعری کو وامقؔ ''نو کلاسیکیت'' (Neo classicism) کا نام دیتے ہیں یہ صحیح ہے کہ ایسی پختہ شاعری اپنا ایک اعتبار نظر رکھتی اور رائج الوقت زبان شاعری سے ہٹ کر وامق کا لہجۂ شاعری ان کے تخلیقی عوامل کا بین ثبوت ہے۔

غرض اس طرح وامق اپنے نظریہ فن واعتقاد یعنی انسان دوستی قومی یکجہتی، ملکی سالمیت اور آزادی ضمیر کے ہمیشہ علمبردار رہے..... اور اپنے آخری ایام تک، ظلم وناانصافی، جبر وفرقہ واریت وسامراجیت کے خلاف سینہ سپر بھی رہے۔

باب ششم

وامق کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

وامق کی غزل گوئی کا تنقیدی جائزہ

وامق نے ۱۹۴۰ء سے شاعری کی ابتدا کی بقول ان کے دو سال تک روایاتی شاعری سے متاثر رہے جس کے وہ خود معترف ہیں۔

''اس وقت جنگ پورے شباب پر تھی سارے ملک میں بھوک اور برہنگی کی آندھیاں چل رہی تھیں۔فرنگی اور امریکی سپاہی سڑکوں اور گلیوں کو روندتے پھر رہے تھے پست متوسط طبقے اور غریبوں کے گھر ویران اور چکلے خانے آباد ہو رہے تھے۔ مذہبی رہنما جنت اور دوسرے جنم کی بشارت دے دے کر صبر و شکر کی تلقین فرما رہے تھے۔مختصر یہ کہ ہم جانب زندگی اور اس کی حسین قدریں فاشیت کے ہاتھوں دم توڑ رہی تھیں۔ یہ حال دیکھ کر ایسا محسوس ہونے لگا کہ جس قسم کی روایتی شاعری میں کر رہا ہوں وہ ایک نا قابل معافی اخلاقی جرم ہے۔ یہی وہ وقت بھی تھا جب ملک کے رجعت پسند ادیب ادب برائے زندگی کے مقابلہ میں اپنے آخری مورچہ سے جنگ کر رہے تھے اس جنگ سے مجھکو بڑا فائدہ ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیئے اب میں محض اپنے ذاتی مشاہدات اور محسوسات سے کام لے رہا تھا اور اس طرح میرے صحیح وجدانِ مقصد کے دور کا آغاز ہوا اور جیسے مجھ کو کچھ تسکین بھی ہونے لگی ''جرس'' اسی دور کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں میری شاعری کے اولین دو سال کے افکار شامل نہیں ہیں

وہ بظاہر بہت حسین مگر بے روح تھے'' [1]

ایسے میں وامق کو اپنے احساسات کی ترجمانی کے لئے وسیع میدان کی ضرورت تھی اسی لئے وامق نے نظم کو ہی اپنے جذبات، احساسات کی ترجمانی کا ذریعہ بنایا۔ اس لئے دنیائے ادب میں وامق کو ایک نظم گو کی حیثیت سے جانا اور مانا جاتا ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انہوں نے غزل کی زمین کو ترک کر دیا تھا۔ اوائل کے دو سال (جس میں انہوں نے اپنی روایاتی شاعری کا اعتراف کیا ہے) کے علاوہ بھی اچھی خاصی غزلیں کہی ہیں جو اپنے فنی۔ حسن کے ساتھ ساتھ جمہوری مزاج سے بھی ہم آہنگ ہیں غزل کے محدود دائرے میں بھی انہوں نے عصر حاضر کے تمام مسائل اور اس کی بے اعتدالیوں، پیچیدگیوں اور نفسیاتی کش مکش کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اور مندرجہ بالا برائیوں کے خلاف احتجاج کی لے ان کی غزلوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔

اپنا اعجاز دکھادے ساقی آگ سے آگ بجھادے ساقی
نقش بیدار مٹادے ساقی ہم کو آزاد بنادے ساقی
وہ جو تسبیح لئے ہے اس کی میرے آگے سے اٹھادے ساقی

طلسم خواب غفلت توڑ کر بیدار ہوتے ہیں
سنبھل جا تشنۂ دولت کہ ہم بیدار ہوتے ہیں
زمیں لرزاں، زماں لرزاں، نگاہ اہرمن لرزاں
کہ اب تیوری ہمارے انقلاب آثار ہوتے ہیں
بھڑکنے کو ہیں شعلے زمہر پر قلب آدم سے
کہ کبہائے تبسم زہر آتشبار ہوتے ہیں

---

[1] وامق کا مجموعہ کلام ''جرس'' ص ۱۴

دوسری جنگ عظیم یہاں اپنے شباب پر تھی اور قریب پوری دنیا اس کے مہلک اثرات سے کراہ رہی تھی اسی دور میں ہندوستاں میں تحریک آزادی بھی اپنے پورے شباب پر تھی اور بلاتفریق مذہب وملت ہر ہندوستانی اپنی اپنی بساط کے مطابق سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف جنگ آزادی کے متوالوں کو کچلنے کے لئے سامراج نے اپنی پوری طاقت جھونک دی تھی اور انھیں قید وبند کی با مشقت سزائیں دی جارہی تھیں۔ اور دادورسن کی زینت بھی بنایا جارہا تھا اس سلسلے میں عوام وخواص کا کوئی امتیاز باقی نہ تھا۔ ایسے حالات میں وامقؔ یوں نعرہ زن ہیں۔

ادھر دی جارہی ہیں رفعتیں دیوار زنداں کو
ادھر آزادیوں کی فکر کامل ہوتی جاتی ہے
ہواؤں کو ادھر ضد ہے کہ اک تنکا نہ رہ جائے
ادھر فکر نشیمن اور محکم ہوتی جاتی ہے

دیوانے، دیوانے مہرے کھیل گئے انگاروں سے
آبلہ پائی اب کوئی پوچھے ان ذہنی بیماروں سے
بات تو جب ہے شعلے نکلیں بربط دل کے تاروں سے
شور میں نغمے پیدا ہوں تیغوں کی جھنکاروں سے
کہہ دو مغنی سے اب ٹھہرے خواب آور نغموں کو روکے
کوئی ہمیں للکار رہا ہے پربت کے میناروں سے
پتھر کا دل پانی زنداں کی تاریخوں پر
آج تلک رہ رہ کر چیخیں اٹھتی ہیں دیواروں سے
ہمارے میکدے کا اب نظام بدلے گا
ہم اپنا ساقی بدل دیں گے جام بدلے گا

ابھی تو چند ہی میکش ہیں باقی سب تشنہ
وہ وقت آ گیا جب تشنہ کام بدلے گا

بدلتی رہتی ہیں قدریں رحیل وقت کے ساتھ
زمانہ بدلے گا ہر شے کا نام بدلے گا

یہ عرش وفرش کی تفریق کچھ نہیں وامقؔ
بلند پست کا معیار خام بدلے گا

بڑی جدو جہد اور جانوں کی قربانیاں دیکر ہندوستان کی آزادی کا وقت آیا۔تو مذہبی ،نسلی اورلسانی عصبیت کے باعث دوقومی نظریہ پروان چڑھا جس کے باعث ملک پہلے دواور بعد میں تین ٹکڑوں میں بٹ گیا اور ہر بٹوارے میں لاکھوں لاکھ انسان وطن سے بے وطن ہو گئے باپ بیٹا بھائی بہن سب ایک دوسرے سے جدا ہو گئے گلی ،کوچے ،سڑکیں اور بازارلہولہان ہو گئے گویا انسانیت زندہ درگور ہوگئی یہ سب مناظر شاعر کی آنکھوں کے سامنے گزرے تھے جو نا قابل برداشت تھے۔

وامق نے اپنے کرب کا اظہار کھل کر اپنی نظموں میں کیا ہے۔غزلیں بھی اس کرب سے اچھوتی نہیں رہیں

جبیں پہ خون ،جگر خوں ، ہاتھ پاؤں پر خوں
تمام خوں سے عبارت یہ خواب یاد رہے
ہر اک لہو میں نہیں انقلاب کی تاثیر
ہر اک چمن نہیں شہر گلاب یاد رہے

''زمانے میں اندھے جو ہیں ذہنیت کے انہیں فرق عیب وہنر ہوتو کیا ہو۔
پلے ہوں جو آغوش میں ظلمتوں کے انہیں تاب شمش وقمر ہوتو ہے یہ اندھیر نگری
بہت دور تک ہے لٹیروں کی بستی بہت دور تک ہے گزرتا ادھر ہی سے ہے

کارواں کو بغیر تصادم گزر ہو کیسے۔''

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے آخر خون سے ہولی کھیلنے کا درد قدرے کم ہوا طوفان نفرتوں کا ختم نہیں ہوا لیکن اس کا زور ضرور ٹوٹ گیا۔ مہاتما گاندھی کے حادثہ قتل نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ مگر سب کو نئے انداز فکر سے سوچنے کا انداز بھی دے گیا ملک میں نئے نئے تعلیمی اقتصاری، سماجی اور فنی تبدیلیوں کا احساس اجاگر ہوا تو ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں نے بھی نئی جہت کی تلاش شروع کر دی۔ اب پھر نعرۂ انقلاب اور اس کی گھن گرج کی جگہ دل درد آشنا نے پھر فریاد شروع کر دی مگر اعتدال کے ساتھ انھوں نے ادب اور سماج کے رشتوں کو برقرار رکھتے ہوئے اردو ادب کو پھر ایک نئی شاہراہ سے متعارف کرایا۔ وامق بھی اپنے وقت کے فنکاروں جیسے فیضؔ، سردار، ساحر، کیفی، سلام، اختر، مخدوم محی الدین وغیرہ سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے فکر و فن کو ایک نیا روپ نیا انداز اور اردو غزل گوئی کو ایک نیا اسلوب دیتے نظر آ رہے ہیں۔

وقت آ گیا انڈیلئے ساغر میں آفتاب
پھر اپنے جوڑے کھول رہی ہے غموں کی رات

وعدہ خلافی کر کے صفائی نہ دیجئے
اس شرط پر ہمیں شب ہجراں قبول ہے

عنایات مخصوص رہنے دے ساقی
ہمیں اک نہیں ہیں، یہاں اور بھی ہیں

زندگی جن کو میسر نہیں آج
ان کو مرنا بھی تو منظور نہیں

پانا جو نہ تھا پا گئے ، جو پایا سو کھویا
اس عہد کی چھوٹی سی یہ پہچان بہت ہے
روتے رہے ہم تو ترے کوچہ میں اکثر
لیکن ترے کشتوں میں ابھی جاں بہت ہے

ایک جگہ اپنے ہم عصروں و اہل نظر سے یوں مخاطب ہیں۔

سنتے ہیں اہل نظر ہوتے ہیں پاگل پیدا — ٹھیک ہے خاک سے ہوتے ہیں بادل پیدا
بانکپن اپنا سلامت ہے تو ہم تشنہ کہاں — دشت بے آب میں کر لیتے ہیں چھاگل پیدا

ہم کو حاجت نہیں نقیبوں کی — شعر اپنا نقیب خود ہی ہے
کوئی ہم کو صلیب کیا دے گا — فن ہمارا صلیب خود ہی ہے
جو صرف چہروں پہ تحریم ہو خبر جانو — زبان حال کو آواز معتبر جانو
جو تخت و تاج سے جیتا ہو اس کو مردہ کہو — وہ سر جو نیزے پہ بولے اسے امر جانو

دنیا میں انسانی زندگی کا جب سے وجود ہوا کشمکش حیات اور مسائل حیات سے ہمیشہ دو چار رہا لیکن پوری بیسویں صدی کے آغاز میں جہاں جاگیرداری و زمینداری و آمرانہ نظام کا بول بالا تھا آج اکیسویں صدی کے آغاز میں وہ قصہ پارینہ بن چکے ہیں اس نظام میں بھی جہاں بہت سی خرابیاں تھیں وہیں سماج میں بہت سی اچھائیاں تھیں اخلاقی قدریں زندہ تھیں اس کے خلاف سماج میں کسی کو بغاوت کی ہمت نہیں تھی روحانیت مادہ پرستی پر غالب تھی سماج کا کوئی فرد اپنے کو تنہا نہیں محسوس کرتا تھا۔

مگر نصف صدی میں یہ ڈھانچہ چرمرا گیا۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے بے پناہ ترقی کی رسل وسائل ذرائع ابلاغ، تعلیم وصحت کی بے پناہ ترقی کے بعد بھی سماج منتشر ہے اخلاقی قدریں پامال ہیں مادیت کا بول بالا ہے بھرے بازار میں آج ہر شخص اکیلا ہے ذہنی انتشار اور خوف کا شکار ہے۔ آج ہفتوں کا سفر گھنٹوں میں ضرور طے ہو رہا ہے مگر اس لمحوں کی دوڑ اور اس کی تباہ کاریاں دہشت گردی، خوف وہراس نے پورے نظام زندگی کو درہم برہم کر دیا ہے۔ وامقؔ کے کلام میں بھی اس کشمکش حیات کا عکس بخوبی دیکھائی دیتا ہے بھلا ایک حساس ادیب وشاعر ایسے میں بے نیاز رہ بھی کیسے سکتا تھا۔

تاراجیِ میخانہ کا امکان بہت ہے
جس رند کو دیکھو وہ پریشان بہت ہے

سفر کا اہتمام ہے نہ راحت قیام ہے
عجب طرح کی صبح ہے عجب طرح کی شام ہے

دل حزیں سے بہاروں کی بات رہنے دو
ہو تشنگی تو نظاروں کی بات رہنے دو

موم ہو جاتا تھا جن کے ہاتھ میں آ کر پتھر
اپنے ہاتھوں سے ہی خود بن گیا آزر پتھر
نرم لہجے میں کڑی بات بھی لگتی ہے بھلی
نہ ہو خوشیوں کا سہارا تو گل تر پتھر

اب کہاں پاؤ گے سکوں وامقؔ
گاؤں بھی شہر ہونے والا ہے

یہ عجب طرح کا دور ہے مگر اپنی رو بھی کچھ اور ہے
میری عمر قابل غور ہے میں چلا ہوں جیسے جواں چلے
جو کھلے نشاں تو قدم اٹھے جو کھلے زباں تو قلم چلے
جو چلے قلم تو رکے ستم کہ نظام امن واماں چلے

کہتے ہیں کہ امید پر دنیا قائم ہے اور اگر یہ امید یاس میں بدل جائے تو پھر انسان کے مقدر میں حرمان نصیبی کے سوا اور کیا رہ جائے اور یہی وجہ ہے جو لوگ پر امید ہوتے ہیں وہ سخت سے سخت حالات میں بھی منفی رجحانات سے گریز کرتے ہیں اور ان کی نگاہیں ہمیشہ مثبت پہلو پر مرکوز رہتی ہیں اور اپنی اسی امید کے ساتھ عوام الناس کے ذہنوں کو بھی حوصلہ بخشتے ہیں اور وہ امید کے سہارے ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھنا جرم سمجھتے ہیں۔

ابھی تو حوصلۂ کاروبار باقی ہے
یہ کم ؟ کہ آمد فصل بہار باقی ہے
خاموش گراں بار فضاؤں میں گھٹن ہے
یہ تو کسی طوفان کی للکار لگے ہے

یہ سیل غم یہ طوفان حوادث اور یہ ناکامی
مگر کب مانتے ہیں زندگی سے ہار دیوانے

امید ہی پر جیتے رہنا توہین ہے جینے والوں کی
اس علم ویقیں کی دنیا میں جینے کے سہارے اور بھی ہیں

یقین سے کام لو وہم و گماں سے کچھ نہیں ہوتا
زمیں کے رہنے والوں آسماں سے کچھ نہیں ہوتا

لیکن وقت اور حالات کی سختیاں اچھے اچھے باعزم اور اہل یقین کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں اور وہ امید و نا امیدی کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں جہاں سے فرار مشکل ہی نہیں ناممکن دکھائی دیتا ہے شاعری کی ذہنی کشمکش کا اندازہ اس کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے۔ وامق کے یہاں بھی کہیں کہیں شکست خوردگی اور مایوسی کا احساس صاف نظر آتا ہے

چل گئیں آندھیاں بجھ گئیں بتیاں لٹ گئیں بستیاں
اٹھ رہا ہے جہاں، آہ بن کر دھواں ہے وہی مرا گھر
راستے پر خطر، ہر قدم ایک سفر زندگی ہے مختصر
پیچ وخم کس قدر راہزن، راہزن راہبر کوئی جائے کدھر

در میکدے کا بند حرم کا چراغ گل
خون جگر پئیں کہ لہو سے وضو کریں

اجنبی لگتا ہے سونا ماحول
پھر کوئی شور مچاؤ لوگوں

آج اس مشینی دور میں آسودہ حال طبقہ جو بظاہر غم دوراں اور غم جاناں دونوں سے بیزار

نظر آتا ہے مگر سب ذہنی انتشار سے دو چار ہیں شاید ہی کوئی خوش قسمت انسان ہو جسے داخلی اور خارجی لحاظ سے خوش نصیب کہا جا سکے، رشتوں کا تقدس بری طرح پامال ہے خاندان کا تصور سمٹ کر افراد تک محدود ہو گیا ہے ایسے ماحول میں پرانی قدروں کے زیر سایہ پروردہ لوگ کس ذہنی کرب میں مبتلا ہیں ان کا دل ہی جانتا ہے کسی شاعر نے اپنے ایک شعر میں ماحول کا سارا درد سمیٹ لیا ہے۔ ؎

فرشتے وقت سے پہلے عذاب دینے لگے
گلی کے لڑکے بڑوں کا جواب دینے لگے

وامق نے بھی پرانی تہذیب کی گود میں آنکھ کھولی جوان ہوئے پھر بھلا معاشرے کی اس کرب ناکی سے وہ کیسے بچ پاتے۔ ؎

کیا دن تھے دل کی باتوں سے ملتا تھا جب سکوں
پتھر سے کس امید پہ اب گفتگو کریں

زہراب پینے والے امر ہو کے رہ گئے
نیساں کے چند قطرے گہر ہو کے رہ گئے
اہل جنوں وہ کیا ہوئے جن کے بغیر ہم
اہل خرد کے دست نگر ہو کے رہ گئے
صحرا گئے تو شہر میں ایک شور مچ گیا
جب لوٹ آئے شہر بدر ہو کے رہ گئے
پابند یوں میں تھے تو دکھاتے معجزے
آزاد یوں میں شہدہ گر ہو کے رہ گئے
وامقؔ دو دھاری تیغ ہے وہ لہجۂ جدید

نغمے تمام خون میں تر ہو کے رہ گئے

اک حلقۂ احباب ہے تنہائی بھی اس کی
اک ہم ہیں کہ ہر بزم میں تنہا نظر آئے

پہچان بھی نہ پائیں گے آپ اپنی شکل کو
ٹوٹا ہے دل کا آئینہ کیا رو برو کریں

ان کے اس درد کی بس ان کی بعض رباعیوں میں صاف سنی جا سکتی ہے

عنوان فسانہ کا نہیں ملتا ہے
کچھ لطف زمانہ کا نہیں ملتا ہے
کیا دوست کو روئیں کہ جہاں میں اب تو
دشمن بھی ٹھکانے کا نہیں ملتا ہے

میں کھو گیا ہوں مجھ کو صدا دے کوئی
کانٹا ہے زباں پیاس بجھا دے کوئی
یہ کان ترستے ہیں نہ جانے کب سے
مجھ کو میری آواز سنا دے کوئی

حالات کمزور انسانوں کے کس بل نکال دیتے ہیں اور پھر نا امیدی و یاسیت کے گہرے غار میں چلا جاتا ہے جہاں سے نکل پانا آسان نہیں ہوتا۔ مگر وامق حالات سے سمجھوتہ کرنے کے قائل نہیں۔ بلکہ آخری سانس تک اس سے نبرد آزما ہو کر اس کا رخ موڑ دینے پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے دل کی

مضبوطی، بلند حوصلگی، ان کا ایمان و یقین انھیں برابر جدو جہد کے لئے للکارتا ہے۔ وہ ظلمت شب کے بعد نورِ سحر پر ایمان رکھتے ہیں اور اسی ایمان و یقین کے سہارے وہ مایوسیوں کے حصار سے نکل کر نغمۂ حیات سنانے لگتے ہیں۔ ؎

نالہ کرنا مرا دستور نہیں
آسماں ورنہ بہت دور نہیں

میرے فکر وفن کو نئی فضا نئے بال وپر کی تلاش ہے
جو قفس کو پاس کے پھونک دے مجھے اس شرر کی تلاش ہے
مرے ناصحا مرے نکتہ چیں تجھے میرے دل کی خبر نہیں
میں حریف ملک بندگی تجھے سنگ در کی تلاش ہے

ملک میں انقلاب آیا، سائنس کے نت نئے انکشاف نے زندگی میں انقلاب کی ایک ہلچل پیدا کر دی اور جب زندگی میں انقلاب آیا فکر ونظر میں تبدیلی آئی، ادب کے لئے بھی نئی راہیں کھولیں کچھ پرانے محاورے ترک ہوئے نئے لہجے اور نئے اسلوب کی باتیں ہونے لگیں وامقؔ کے نزدیک یہ تبدیلیاں فال نیک کی حیثیت رکھتی ہیں وہ خود فرماتے ہیں:

''ادھر شاعری کا لہجہ بدلا، نئے نئے محاورات، علامات ترکیبیں، شعور میں تبدیلی واقع ہوئی۔ میرے لئے یہ سوال تھا کہ حالات حاضرہ اور ان سے پیدا ہونے والے عصری مطالبات کو پوری طرح سمیٹ کر کس زبان میں بیان کروں۔ نیا لہجہ بلا اختراع کے ممکن نہیں .....کلاسیکی اسٹائل سے میں نے ترقی پسند ادب کو برتا ہے۔'' [۱]

---

[۱] ایس، ایم عباس- وامق جونپوری شخص اور شاعر ص ۱۹۲

بلا شبہ وامق نے سماج اور ادب کے بدلتے ہوئے انداز کا خیر مقدم کیا ہے اور پورے عزم کے ساتھ اپنی پوری تخلیق میں برتا بھی ہے وہ فن اور زندگی کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹتے اسی لئے ان کے کلام میں زندگی اور ادب کی تبدیلیوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

وامق نے اپنے شروع کے دو سال کی شاعری کو اپنے شعری مجموعے ''جرس'' میں اس لئے نہیں شامل کیا کہ بقول ان کے وہ بظاہر بہت حسین مگر بے روح تھے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ انھیں سرے سے نظر انداز کر دیا جائے۔ ان میں بہت سے اشعار کو حاصل غزل کہا جا سکتا ہے۔ ؎

جو دور سے اسے دیکھو تو چاند جیسا لگے
قریب جاؤ تو پتھر دکھائی دیتا ہے

دل کے ویرانے کو یوں آباد کر لیتے ہیں ہم
کر بھی کیا سکتے ہیں تجھ کو یاد کر لیتے ہیں ہم

اسے بھلانے کی کوشش بھی ہوگئی بیکار
اسے بھلانا اسی کا خیال ہے پھر بھی

جن کا غم آج بہت کام آیا
ہنس دئے ہم جو ترا نام آیا

وامق تقلید کے قائل نہیں تھے اور تقلید جامد کے تو بالکل ہی نہیں، وہ دوسروں کے افکار وخیالات سے جلدی مرعوب نہیں ہوتے اپنی راہ انھوں نے خود متعین کی اور اسی پر چلتے رہے ان کی اپنے ڈھب سے کہی ہوئی غزلیں اس کا جیتا جاگتا ہوا ثبوت ہیں جن میں ان کے مزاج کا والہانہ پن بے خوفی و بیباکی نمایاں ہے صاف گوئی ان کی سرشت میں داخل ہے خود احتسابی کے قائل ہیں۔ ؎

جنوں مشرب جنوں ساماں، جنوں کردار دیوانے
مگر یاروں کی محفل میں سراپا بار دیوانے

ٹپک ٹپک اے سرشک پیہم چھلک چھلک اے پیالۂ غم
کہ خاک ساحل ملے گا ان کو نہ جن کو راس آئیں تیز دھارے

مجھے اس جنوں کی ہے جستجو جو چمن کو بخش دے رنگ و بو
جو نوید وصل بہار ہو مجھے اس نظر کی تلاش ہے
مجھے عشق حسن حیات سے مجھے ربط فکر ونشاط سے
مرا شعر نغمۂ زندگی مجھے نو حہ گر کی تلاش ہے

اس مجموعۂ کلام ''شب چراغ'' میں شامل بعض نظمیں بہت ہی خوبصورت اور جاندار ہیں جو چھوٹی اور بڑی دونوں بحروں میں کہی گئی ہیں۔ اس میں بڑی بحر کی ایک غزل جس کے چند اشعار پہلے لکھے جا چکے ہیں۔ اس کے اور اشعار دیکھیں بالکل کلاسیکی انداز میں ہیں۔ ؎

راستے پر خطر ہر قدم اک سفر زندگی مختصر
پیچ وخم کس قدر راہزن راہبر، کوئی جائے کدھر
بھائی بے خبر میرے میخانہ پر کس نے ڈالی نظر
مرکز آرزو ، کتنے جام وسبو ،رہ گئی ٹوٹ کر
دردغم جاتے ہی ،فصل گل آتے ہی ،اذن دم پاتے ہی
ایسی بجلی گری، قید سے چھٹتے ہی جل گئے بال وپر
چل گئیں آندھیاں بجھ گئیں بتیاں لٹ گئیں بستیاں
اٹھ رہا ہے، جہاں آہ بن کر دھواں، ہے وہی میرا گھر
شیشۂ دل میں بس بھر دے یادوں کا رس اے مسیحا نفس
جز ترے ستوں کے ،اس غم دہر سے ورنہ کس کو مفر

حسن ضرب المثل ہر ادا برمحل ، تو سراپا غزل
جس طرح چاندی میں نہایا ہوا تاج آئے نظر

وامق نے چوتھے مجموعہ کلام ''سفر نا تمام'' میں اپنے نظریات اور کلاسیکل اسٹائل کو بروکار لانے کی کامیاب کوشش کی ہے بقول ایس ایم عباس کے

''انھوں نے ''سفر نا تمام'' میں زبان ، بیان ، علامتوں اور ترکیبوں کے استعمال میں ایک اجتہاد سا کیا ہے فنی لوازمات فکری بصیرت ، تہہ داری ، فن اور حسن کا امتزاج ان سب باتوں نے کلام میں دلکشی اور رعنائی پیدا کردی ہے'' [۱]

سفر نا تمام میں بھی مختصر اور طویل دونوں بحروں میں غزلیں شامل ہیں بلا شبہ وہ اپنا ایک الگ اسٹائل والگ رنگ رکھتے ہیں ۔ ان میں کچھ غزلیں فنی اور معنوی انداز سے منفرد ہیں ۔ نئے اسلوب ، استعارے ، تشبیہات ومحاوروں نے اسے اور خوبصورت سے خوبصورت بنا دیا ہے جو ان کی واقعاتی ، جذباتی وابستگی کے ساتھ ساتھ ان کی عصری آگہی کا ثبوت بھی ہیں ۔

رات کا سناٹا اور اک خوشبو
میری خلوت میں آگئے تم کیا
ایک دن تم بھی جاؤ گے وامقؔ
میرے سب دلربا گئے تو تم کیا

رواں دواں ہے کن فکاں
نشور کائنات سن
جو لکھ رہا ہوں موت کو
وہ نامۂ حیات سن

شہر میں تنہا گھوم رہے ہو
گھر بھر میں کہرام پڑا ہے
آپ اور میرا خانہ ویراں
کہئے کوئی کام پڑا ہے

دشت جنوں سے آبلہ پالو ٹتے ہوئے
لائے ہیں اپنے ساتھ گلوں کی بارات ہم
سویا کئے ہیں ڈھانپے ہوئے منھ ترے بغیر
جاگا کئے ہیں پاس ترے رات رات ہم
تم جس کو برا کہہ دو برا اسکو کہیں سب
اس حکم کو سب نے کبھی مانا تو نہیں ہے
آزادی تنقید ہر انسان کا حق ہے
اس جنگ میں انساں کبھی ہارا تو نہیں ہے
حق گوئی بہرحال ہے وجدان کی آواز
منصور سردار تماشہ تو نہیں ہے

جس دن سے بادہ خواروں کی راہیں بدل گئیں
پیران میکدہ کی قبائیں.....بدل گئیں
کشتی اب اپنے ہاتھوں سے کھینچنے کا وقت ہے
جب کھولے بادباں ہوائیں بدل گئیں

فلک پہ ٹک نہ سکے ہم زمیں کے بھی نہ رہے
اَنا کے پر لگے ایسے کہ ہم کہیں کے بھی نہ رہے
ستارے ہم تھے ہمیشہ کے روشنی کی رفتار
ہوئے وہ دور کہ اب دور بین کے بھی نہ رہے

دور بین کا استعمال واقعی قابل داد ہے۔ وامق کی اس طرح کی غزلوں عصری تقاضوں کے ساتھ ساتھ حسن بیاں، حسن فن کلاسیکی زبان لفظوں کا صحیح انتخاب اور ان کی سادگی یقیناً قابل تعریف ہے ان کی خوبصورت غزل کے نمونے دیکھتے چلیں۔

ہو رہی ہے روبرو ایسی جبیں سائی کہ بس — کیا ابھی باقی ہے کوئی اور رسوائی کی بس
آشنا راہیں بھی ہوتی جارہی اجنبی — اس طرح جاتی رہی آنکھوں کی بینائی کہ بس
تا سحر کرتے رہے ہم انتظار ماہِ نو — دیکھتے ہی دیکھتے ایسی گھٹا چھائی کہ بس
کچھ شعور وحس کا ہے بحران ہم میں ورنہ ہم — عہد نو کی اس طرح کرتے پذیرائی کہ بس
کیا نہیں کج عکس آئینوں کا دنیا میں علاج — جس کو دیکھو ہے عجب محو خود آرائی کہ بس
اس حسین گیتی کے کھل کر رہ گئے سب جوڑ و بند — چند پاگل ذروں کو آئی ایسی انگڑائی کہ بس

مندرجہ بالا اشعار میں ایٹم بم کی تباہی کا پورا نقشہ جس طرح سمو دیا گیا ہے وہ ان کی زباندانی اور فن کا مسلم ثبوت ہے۔

کون شاعر تھا کہیں کا کون دانشور مگر
دفتروں کی دوڑ وامقؔ ایسی راس آئی کہ بس

الفاظ کا انتخاب اور اس کا برمحل استعمال کلام میں جان ڈال دیتا ہے اور اس سے بہت سے بے معنی اور مہمل الفاظ بھی خوبصورت اور بامعنی ہو جاتے ہیں۔ بغیر کسی پرواہ کے وامق نے اپنے کلام میں ایسے تجربے خوب کئے ہیں۔

نہ بھٹکیں ظلمتوں میں شمع دل جلائیں سب
سب اس کو مانیں تو ہم بخش دیں خطائیں سب
یہ رات اژدہے کا بطن ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ
دکھائی دیتا نہیں ! راہیں چھائیں چھائیں سب
ہجوم بڑھتا چلا جارہا ہے سڑکوں پر
سلامتی ہے اسی میں کہ باتیں جائیں سب
ہماری باتوں کا دیتا نہیں جواب کوئی
اڑاتے رہتے ہیں بس آئیں باتیں، شاہین سب
نظام عدل ہے وامقؔ مثال کج دم سگ
جدید جرم پارنی مگر سزائیں سب

وامق کو واقعی اپنی متعین کردہ راہ پر چلنے پر فخر بیجا بھی نہیں اس کو انھوں نے بتایا اور برتا بھی۔ وہ شاعری کے نشیب وفراز سے واقف ہیں۔ اپنے ان اشعار میں وہ اپنی بات وجذبات کی ترجمانی اس انداز سے کرتے ہیں کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ زبان وبیان کا لطف اس چھوٹی بحر کی غزل میں دیکھیں۔ ؎

خاک پرسر پرانیاں کیا کیا — کہہ رہی ہیں کہانیاں کیا کیا
کہہ رہی ہیں زبان حال سے کچھ — چیختی بے زبانیاں کیا کیا
سطح پر ایک جمود طاری — زیر دریا روانیاں کیا کیا
رکھ کے شہ رگ پہ تیغ پہنچ وہاں — تھیں جہاں بدگمانیاں کیا کیا
اس کھنڈر کو بنا دو تاج محل — دفن ہیں یاں جوانیاں کیا کیا
بن گئے سب غلام ابن غلام — بک گئیں حکمرانیاں کیا کیا

خواب عبرت کی ہیں یہ تعبیریں　　رانیاں نو کرانیاں کیا کیا

اس قلم کا اڑادو سر یارو　　لکھ رہا ہے کہا نیاں کیا کیا

وامقؔ زبان وقلم کے ذریعہ بسیار گوئی کے قائل نہ تھے، وہ کم بولتے اور کم کہتے تھے مگر خوب کہتے تھے حق گوئی و بیبا کی ان کا مسلک تھا۔ اس کے لئے انھوں نے کبھی مصالحت کی اور نہ مصلحت سے کام لیا۔ مزاج میں عزت اور خودداری تھی۔ خوشامد پسندی اور چاپلوسی سے سخت نفرت تھی نہ خود کرتے تھے نہ اپنے لئے پسند کرتے تھے ان کے دو شعر ان کے مزاج کی عکاسی کرتے ہیں۔ ؎

کیا ضروری ہے کہ دیوان پر دیوان لکھوں

ایک شعر ایسا کہو زندۂ جاوید رہو

آہن نہیں کہ چاہئے جب موڑ دیجئے

شیشہ ہوں مڑ تو سکتا نہیں توڑ دیجئے

وامق کی تخلیقات کے بارے میں خود وامق صاحب فرماتے ہیں

''اپنی تخلیقات کی طرف سے مطمئن ہو جانا ناپیدا کنار امکانات کو جھٹلاتا ہے تاہم میں بڑی حد تک اپنی تخلیقات کی طرف سے مطمئن ہوں اور اس پر بھروسہ رکھتا ہوں کہ اس میں میں نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک لگا دیا ہے اور اس سے زیادہ میرے بس میں نہ تھا۔ [۱]

---

[۱] وامق جونپوری سے ایک انٹریو۔ انقلاب بمبئی ۱۹۸۴ء

باب ہفتم

خودنوشت سوانح (گفتنی ناگفتنی) کے حوالے سے وامق کی نثر نگاری کا جائزہ

خودنوشت سوانح (گفتنی ناگفتنی) کے حوالے سے نثر نگاری کا جائزہ

شاعری کی طرح نثر نگاری بھی ایک فن ہے۔ شعر میں جس طرح الفاظ کا برمحل استعمال خوبصورت تشبیہات واستعارات کنائے اور عام فہم زبان جس طرح سننے والے کو متاثر کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح خوبصورت نثر جو مناسب الفاظ سیدھی سادی صاف ستھری زبان واظہار مدعا کا خوبصورت پیرایہ بھی قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی مرصع ومسجع ومقفی تحریروں کے مقابل غالب کے خطوط کی زبان جو تصنع سے پاک سیدھے سادھے انداز میں زیادہ پسند کی گئی اور بعد کے بے شمار ادیبوں نے ان کی پیروی کی جس سے اردو نثر نگاری نے ایک نئی راہ متعین کی جس سے ناول افسانے مقالات، خطبات سبھی متاثر ہوئے حتی کی قرآن کی تفاسیر بھی پرانے اسلوب سے ہٹ کر بالکل نئے انداز میں عوام کے سامنے آئیں۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک اردو شاعری کے انداز فکر کو بدلا وہیں اس نے اردو نثر کو موضوع ومواد کے علاوہ اس کے ہئیت واسلوب کو بھی نیا رنگ دیا نثر میں بھی کوشش کی گئی کہ اسے عوامی ادب بنایا جائے اور اس کے لئے ضروری تھا کہ عوامی مسائل کے موضوع کے ساتھ زبان بھی عام فہم استعمال کی جائے جس سے عوام متاثر ہوں اور ایسی تحریریں عوام سے اپنے عوامی ادب ہونے کی سند حاصل کریں۔ وامق بھی اسی دور کی پیداوار ہیں اور جس طرح انھوں نے شاعری کی ایک نئی راہ متعین کی ان کا یہ انداز ان کے نثر پاروں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے اور اردو شاعری کے سلسلے میں ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو

''ولی دکنی نے اردو شاعری کو گھٹنوں چلنا سکھایا، میر اور سوؔدا نے اس کو اپنے

پیروں پر کھڑا کیا ناسخ اور آتش کے دور میں اس کے خد وخال ابھرے اور چہرہ مہرہ نکھرا اور مومنؔ، ذوقؔ اور غالبؔ کے زمانے میں تو یہ حسینہ ایسی جوان ہوئی کہ آج تک اس کے حسن وشباب کو زوال نہیں'' ۱؎

کیا اتنے مختصر الفاظ میں اردو کی اتنی مکمل اور حسین تاریخ بیان کر دینا ان کے انوکھے طرز نگارش کی دلیل نہیں۔ ان کی نثری صلاحیت کا اندازہ غالب کی عظمت پر لکھے گئے مضمون کے اس اقتباسات سے بھی لگایا جا سکتا ہے

''غالب کی عظمت کی اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد جیسا جادو اثر انشا پرداز آب حیات میں ذوقؔ کی منقبت میں زمین وآسمان کے قلابے ملانے کے باوجود محض اس قدر عہدہ برا ہو سکا کہ شہرے کے سلسلے میں غالب کے ساتھ ذوق کا بھی نام لیا جانے لگا مگر غالبؔ کی شہرت، عظمت ومقبولیت کوئی اتفاقی امر تو نہیں ہے اس کے متعدد اسباب ہیں جن کی بنیادیں ان ٹھوس حقائق پر قائم ہیں جس کا حامل ہونے میں کوئی فنکار عہد آفریں شاعر بن سکتا ہے اور وہ حقائق ہیں مرزا غالب کی واقعیت پسندی، جدت طرازی فکر ونظر کی گہرائی، زندگی اور انسانی نفسیات کا عمیق وبسیط مطالعہ، انوکھا پن شگفتگی وتازگی .....۲؎

وامق کا نظریہ یہ ہے کہ

''جتنا اچھا انشاء پرداز ہوگا اتنا ہی اچھا شاعر بھی ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ہر انشاء پرداز شاعر ہو سکتا ہے یعنی شاعر کا نثار ہونا ضروری ہے جبکہ نثار کا شاعر ہونا یقینی نہیں'' ۳؎

ان کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ

''نثری ادب میں خودنوشت سے زیادہ مشکل کوئی اور صنف نہیں ہے''۔

اور اسی لئے شاید انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات گفتنی ناگفتنی لکھی جو اچھی خاصی ضخیم یعنی ۴۳۲ صفحات پر مشتمل ہے جسے بلا شبہ ان کا منفرد کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات و ماحول، وشجرۂ نسب سے لے کر اپنی پیشہ دارانہ زندگی، جنگ آزادی، جنگ عظیم، تہذیبی سماجی وثقافتی، سیاسی انقلاب واقعات حادثات وشخصیات پر کھل کر تبصرہ کیا ہے۔ جس سے ان کے داخلی وخارجی حالات ومعاملات خود ان کے مزاج ونفسیات وجذبات کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے اس کے علاوہ ان کی پسند وناپسند، مذاق ومزاج کا پتہ چلتا ہے اپنی خودنوشت کے دیباچے میں وامق رقمطراز ہیں۔

''میں نے اپنے دل کو اس طرح تسکین دے لی کہ میرے خاندان کے لوگ اپنی خوش فہمی کی بنا پر میری حقیقت بیانی کو پاناگفتنی کو زیب داستاں سے زیادہ اہمیت نہ دیں گے اور ایک شاعر کی فن کارانہ تخلیق پر محمول کر کے قابل یقین نہ سمجھیں گے اس لئے اس کو یوں ہی چلنے دو اور اس طرح اپنے کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا چنانچہ یہ کہنا درست ہوگا کہ گفتی ناگفتنی میں گفتنی سے زیادہ ناگفتنی ہے اور اس کی یہی خصوصیت اس خودنوشت کی صداقت پر دلالت کرتی ہے۔

گفتنی ناگفتنی میں وامق نے اپنے خاندانی حالات کے ساتھ ساتھ جونپور کی تاریخی، علمی اور تہذیبی اقدار پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے مکتب سے لے کر کالج تک کے بعض دلچسپ واقعات، دیرینۂ احباب ومقامات ادبی مجالس وشاعروں کو بڑے دلچسپ وفن کارانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انداز بیان میں ان کی بیباکی اور برجستگی نے تحریر کو اور دلچسپ بنا دیا ہے اپنے خاندانی ماحول کو وہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

''خاندانی تہذیب کا یہ عالم تھا کہ بزرگوں کو لفظ آپ سے مخاطب کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا حضور کے لقب سے مخاطب کرتے تھے اور خط وکتابت میں بزرگوں کو ''عرض عالی میرساند'' یا مختصر تحریر میں عرض می شود کے القاب استعمال ہوتے تھے جو کم وبیش اب تک رائج ہیں''

جونپور کی ادبی وعلمی وتہذیبی حیثیت کے بارے میں وہ یوں کہتے ہیں

''عہد مغلیہ میں جون پور اپنے علم وفضل اور ملک میں قومی ہم آہنگی کا پیش رو ہونے کے اوصاف کی بنا پر اکبر اور شاہجہاں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اپنے دور حکومت میں اکبر نے قلعہ جونپور میں کئی بار گئے تھے اور یہاں کے اکابر علوم وفنون سے ملتے رہتے تھے۔ جون پور کو شاہجہاں فخریہ ''مشرق کا شیراز' کہتے تھے اور یہاں کے دانشوروں کی سرپرستی کرتا تھا یہ جونپور کا ماضی وسطیٰ تھا اس کے آئینہ میں جب ہم جونپور کو دیکھتے ہیں تو اس کی عمارات میں ایک نہایت گراں قدر اور شاندار اضافہ ملتا ہے۔

آگے وہ یوں رقمطراز ہیں جس میں ان کے چھپے ہوئی درد کو محسوس کیا جاسکتا ہے کہ اب وہ علمی وادبی گہوارہ ویران ہے۔

''بہرکیف جون پور اپنی قدیم روایتی شہرت کو اپنی امرتی، خربوزہ، مولی، مکا کی بالی، چمیلی کا تیل اور عطریات نے برقرار رکھے ہوئے ہیں''۔

گفتنی ناگفتنی

بچپن میں اپنے گھریلو علمی وتہذیبی ماحول کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں

''ہمارے معلم خاص مولوی متوسط حسین صاحب اور ان کے احباب جمع ہوکر گفتگو کرتے تھے تو وہ سننے کے لائق ہوتی تھی۔ان میں ہر ایک فارسی

اور اردو ادب بالخصوص شاعری کا عبقر اور عالم معلوم ہوتا تھا''۔

گفتنی ناگفتنی

''جب میں آٹھویں جماعت میں تھا تو سنٹر کالج الہ آباد سے تبدیل ہو کر شیخ مہدی حسن ناصری صاحب ہمارے ہیڈ ماسٹر ہو کر بارہ بنکی آ گئے تھے ان کے علم وفضل ان کی قابلیت ان کی شخصیت ان کا حسن اخلاق ان کی گلبار تقریریں سب کے ساتھ ان کی شفقت ومحبت مثالی تھی''۔

گفتنی ناگفتنی

وامق بچپن سے لے کر جوانی تک بارہ بنکی میں رہے اس لئے بارہ بنکی سے ان کا جذباتی لگاؤ فطری تھا مختلف طریقے اور خوبصورت انداز میں بارہ بنکی میں گزرے لمحات وواقعات کا چٹخارے لے کر ذکر کیا ہے وہ خود معترف ہیں کہ اپنے وطن کے بعد اگر کسی شہر نے متاثر کیا ہے تو وہ بارہ بنکی ہے اور واقعی ان کی ذہنی وادبی تربیت بڑی حد تک بارہ بنکی کی ممنون ہے بارہ بنگی کے ماحول کا نقشہ یوں کھینچ رہے ہیں

''بارہ بنکی کے کلچر کو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ اس کے قصبہ رودولی کا کلچر ہے لکھنؤ کے کلچر میں قدرے تصنع ہے جو ہر مرکزی تہذیب میں ہوتا ہے اور جو بارہ بنکی کی تہذیب میں نہ تھا بارہ بنکی کے لوگوں میں اخلاص گھریلو پن اور بے تکلفی ملتی ہے اس تہذیب کی چند نمائندہ شخصیتیں یہ ہیں جن سے میرا بچپن اور جوانی متاثر ہوئی تھی چودھری صاحبان پیار مصطفیٰ کامل قدوائی، انیس باجی قدوائی اور سجاد بھائی قدوائی وغیرہ''۔

گفتنی ناگفتنی

اپنے بارہ بنکی چھوٹنے کا بیان جس انداز سے کیا ہے اس میں ان کا کرب بآسانی محسوس

کیا جا سکتا ہے

''غرض کہ بارہ بنکی سے فیض آباد جانے کی تیاریاں شروع ہوگئی بارہ بنکی چھوٹنے کا مجھے بڑا غم تھا بارہ بنکی سے مجھے ایک جذباتی لگاؤ رہا ہے یہاں میرا بچپن گزرا ہے یہاں سے مجھے نوجوانی ملی ہے یہاں میری معصومیت کی قبر ہے''

گفتنی ناگفتنی

اپنے لکھنؤ یونیورسٹی کے زمانہ طالب علمی کا ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں

''باقر ظہیر، بنے بھائی کے چھوٹے بھائی اور میں نے مل کر لکھنؤ یونیورسٹی میں ''انگارے کی دو سو کاپیاں فروخت کی تھیں اس کے کچھ دنوں بعد افسانوں کا یہ مجموعہ بحق سرکار ضبط ہوگیا''

وامق صاحب بارہ بنکی میں اپنے ماموں کے ساتھ رہتے تھے جو شکار کے بے حد شوقین تھے اور جب شکار کے لئے جاتے تو شکار پکڑنے یا دوڑانے کے لئے کسی نہ کسی بچے کو ضرور لے جاتے چونکہ وامق بچوں میں بڑے تھے اس لئے انہیں ان کے ساتھ شکار کا زیادہ موقع ملا ان کے ماموں انہیں شکار کے گر سکھاتے اور بندوق چلانا بھی سکھاتے جس کے باعث وامق کو بھی شکار کا شوق پیدا ہوگیا۔ جس کا ذکر یوں کرتے ہیں

''بوبو کے چھوٹے بھائی (ماموں) سید حماد علی صاحب بھی بارہ بنکی میں ساتھ رہتے تھے اور شکار کے بہت شوقین تھے۔ رائفل اور بندوق کا نشانہ بہت اچھا تھا وہ ہم سب بچوں کو شکار پر ضرور لے جایا کرتے تھے (بالعموم اتوار کے روز) کبھی قریب کبھی دور۔ از راہ شفقت مجھ کو بھی جو بچوں کی برادری میں بڑا تھا۔ بندوق چلانے کا موقع دیدیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں مرحوم ہی نے میرا داخلہ گورمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی میں پانچویں جماعت

میں لکھوادیا تھا۔ اور داخلے کے وقت میری تاریخ ولادت ۲۳/اکتوبر ۱۹۰۹ء
کے بجائے ۲۳ فروری ۱۹۱۰ء لکھوادی۔ جس کا علم مجھ کو ہائی اسکول کے بعد
ہوا۔ چونکہ صرف چار ماہ کا فرق تھا اس لئے کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی اور
آج تک سارے دستاویزات میں ۱۹۱۰ء ہی ملتا ہے''

گفتنی ناگفتنی

آگے اپنے شکاری شوق کے بارے میں مزید یوں لکھتے ہیں۔

''ماموں کے بارہ بنکی سے چلے جانے کے بعد ان کے شکاری دوروں کو میں
نے سنبھال لیا تھا۔ اب میں اپنے ہم عمروں اور اکبر خاں رودولی کو ساتھ لیکر
دور دور تک شکار کھیلنے لگا تھا قصبہ کنتور کے سامنے گھاگھرا دریا کے پچھار میں بے
انتہا شیر، اور ہر چوپائے کا شکار ملتا تھا۔ سانبھر، بارہ سنگھا، بنڈ بلا اور بہت
فاصلے پر کبھی کبھی گھڑیال بھی خود بہرہ ریاست کے اندر قلعہ سے قریب جھیل
انواع واقسام کی مرغابیوں اور مچھلیوں سے پٹی پڑی تھی طویل عریض اتنی کہ
بغیر کشتی کے شکار تک پہونچنا مشکل ہوتا تھا۔ پانی اس قدر صاف وشفاف کہ
تہ کی مچھلیاں دکھائی دیتی تھیں نشانہ اتنا صحیح ہوگیا تھا کہ سوگز کے فاصلہ پر رائفل
سے روشنائی کی بوتل اڑادیا کرتا تھا۔ بابا شکار کھیلنے کو زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔
مگر موصوف ہریل اور چڑے کا گوشت بہت پسند کرتے تھے۔ اس لئے عتاب
سے بچنے کے لئے ہر شکاری دورے میں ہریل وغیرہ ضرور مارے جاتے تھے۔

گفتنی ناگفتنی

آگے چل کر وامق نے اپنی خودنوشت میں بارہ بنکی کے ذکر کو جس انداز سے الوداع کہا ہے
وہ ان کے نثری اسلوب کا بہترین نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ ان کا یہ انداز بھی ملاحظہ ہو

''یہ باب ختم ہونے جارہا ہے اور میں اب یہاں سے مجبوراً کوچ کررہاں ہوں اور اس وقت انگنت یادیں ذہن میں سر اٹھارہی ہیں اور کہہ رہی ہیں ''اوتاوان تو'' ہم کو اتنی جلدی بھول گیا۔ ہم کو تو تجھ پر بڑا بھروسہ تھا تو نے اس لئے ہمارا ذکر نہ کیا کہ ہم کو غیر اہم سمجھتا ہے تو نے شاید یہ فرض کرلیا ہے کہ شاید ہم نے تیری شخصیت کے ارتقاء میں کوئی خاص کردار نہیں ادا کیا۔ مگر یہ تیری غلطی ہے۔ کیا ٹھاکر جے کیرت سنگھ بھٹ ڈپٹی کلکٹر نے پولس لائن کے کھیل کے میدان میں گھونسے مار مار کر تجھ کو فٹ بال کھیلنا نہیں سکھایا؟ کیا علی شیر کے ساتھ فٹ بال کھیلنے میں تو فخر نہیں محسوس کرتا؟ کیا تو نے بابو کے بڑے بھائی کے ساتھ ہاکی نہیں کھیلی؟ کیا تو نے شمش الدین کے ٹٹو پر بیٹھ کر گھوڑ سواری نہیں سیکھی تھی؟ کیا تو نے چدا فقیر کے چکارے پر ہر جمعرات کو اس کے فی البدیہہ اشعار نہیں سنتے تھے۔ کیا تو نے بیگم گنج کے کبابچی کی ہانک سن کر اور بزرگوں سے آنکھ بچا کر پھاٹک سے باہر سڑک پر نہیں آجایا کرتا تھا؟ کیا تو نے ملک کے بہترین مقرر مثلاً مولانا سبط حسن صاحب، مولانا ابن حسن صاحب تو نہروی اور حکیم مرتضیٰ صاحب کو پہلی بار یہاں نہیں سنا تھا؟ دولھا صاحب نبیرہ، انیس کو تازہ کلام تحت الفظ مین پڑھتے نہیں دیکھا تھا؟ کیا تو نے سجاد حسین صاحب اور منبھو صاحب کی سوز خوانی پہلی بار یہاں نہیں سنی تھی؟ کیا تو کوٹھی اور جمیر یا نالے کے درمیان لمبے میدان میں اپنے ہم جماعت لچھمی نرائن صراف سے کنکوؤں کے پیچ نہیں لڑایا کرتا تھا؟ کیا تو ماسٹر کبیر صاحب کے ساتھ جمریا نامے کے پل کے قریب بسے ہوئے گھوسیوں کی جوان اور حسین لڑکیوں کو گوشۂ چشم سے تاکتے جھانکتے نہیں جایا کرتا تھا؟ کیا یہاں کی مٹی نے تیرے ان سوئے ہوئے جذبۂ بغاوت وانحراف کے شانے نہیں ہلائے تھے جو تیرے قلب میں تیرے جد امجد مولانا حشمت علی صاحب سے

تجھ کو ملا تھا؟ اور چوتھی پشت میں جس نے سر اٹھایا تھا''

گفتی ناگفتنی

وامق صاحب نے کتنے افسانوی اور دلچسپ انداز میں اور مختصر الفاظ میں بے جھجک بلا کم وکاست اپنے عیب و ہنر کا مرقع کھینچ کے رکھ دیا ہے اور قاری کے سامنے ساری تصویریں سینما کے پردہ کی طرح متحرک نظر آتی ہیں اور قاری کو کہیں سے بوریت نظر نہیں آتی۔ ایسا ہی ایک مرقع انھوں نے کھینچا ہے الہ آباد یونیورسٹی کا۔ جب وہ نئے نئے الہ آباد یونیورسٹی میں داخل ہوئے تھے اور انھیں زندگی میں پہلی بار (Introduction night) یا شب تعارف سے پالا پڑا تھا۔ انداز تحریر اتنا سادہ اور پرکشش ہے کہ ہر قاری اپنے کو اس بزم میں شریک محسوس کرتا ہے

''الہ آباد یونیورسٹی جولائی میں کھلتی تھی اور لکھنؤ یونیورسٹی یکم اگست کو، جب میں الہ آباد میں B.Sc میں داخلہ لیا اور اس اثناء میں مسلم بورڈنگ ہاؤس میں جہاں میرا قیام تھا شب تعارف آ گئی کسی نئے طالب علم کو خبر نہ تھی کہ یہ بلا کب نازل ہونے والی ہے ۲۷-۲۸ جولائی کے درمیانی شب میں دو بجے ''تازہ واردان سادا عزم'' پر پانی کے گھڑے اور صراحیاں ٹوٹنے لگیں اور پلنگ الٹے جانے لگے جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ دس پندرہ منٹ تک پورے ہاسٹل میں بادل پھٹ پڑنے کا منظر رہا۔ ہوسٹل میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا اس کے بعد روشنی ہوگئی اور سب نئے لڑکے مویشیوں کی طرح ہنکا کر ہال میں لائے گئے اور ایک ایک قیدی کو میز پر کھڑا کیا جانے لگا اس سے انواع واقسام کے سوالات پوچھے جانے لگے اور ہر جواب پر پرانے اہل اقامت گاہ قہقہہ لگاتے تھے اور بیوقوف بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ میں اندر ہی اندر جل بھن کر خاک ہو رہا تھا کہ میرا نمبر آ گیا کسی نے سوال کیا اپنا نام بتاؤ؟ میں نے جواب دیا کس جرم میں کسی نے کہا بتلاتے ہو کہ نہیں میں نے کہا پہلے اپنے سوال کو

تہذیب کے دائرے میں لائیے یعنی دریافت کیجئے کہ آپ کا اسم گرامی کیا ہے۔ اور آپ حضرات میں سے ایک یا دو صاحب چور ہیں جنھوں نے میرے بکس میں سے تالا توڑ کر ڈائری چرالی ہے۔ میرا یہ انداز گفتگو سب کے لئے غیر متوقع تھا۔ بہر حال اپنی چھیب مٹانے کے لئے سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اور دریافت کیا کہ ''تم کو ہنسنا آتا ہے'' آتا ہے مگر بے محل نہیں ''رونا آتا ہے؟ کس کے حال پر آپ کے حال پر یا اپنے حال پر'' گانا آتا ہے؟ جی ہاں مگر کوئی سمجھنے والا ہو تب ان دندان شکن جواب پر ان میں جو حضرات مجھ سے عملی مذاق کی تیاری کر رہے تھے انھیں میں سے ایک طویل القامت پھرتیلے بدن اور تقریباً میری ہم عمر کا طالب علم بڑھ کر میرے سامنے کھڑا ہوا مجھ سے تقریباً چھ انچ قد میں اونچا میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا کہ میاں تم کہاں کے رہنے والے ہو'' میں نے کہا شیراز ہند جونپور کا'' وہاں کس خانوادے سے تعلق رکھتے ہو میں نے جواب دیا کہ جس میں بزرگ کو حضور کے لفظ سے خطاب کئے جاتے ہیں اور خورد آپ اور صاحب سے۔ آپ کا اسم گرامی؟ خاکسار کو احمد مجتبیٰ کہتے ہیں اور میں نے مزید لقمہ دیا کہ ''یہ تو یک طرفہ تعارف ہے آپ بھی تو اپنا نام نامی ارشاد فرمائیں ''میرا نام محمد اسلم خاں رامپوری ہے'' اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''یارو یہ اصیل ہے چابک اور مہمیز برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کو پیار اور صرف پیار سے رام کیا جا سکتا ہے'' میں نے کہا خاں صاحب آپ درست فرماتے ہیں ''ہم انا پر گردن کٹوا سکتے ہیں گردن جھکا نہیں سکتے اس کے بعد ہم ہال سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔''

وامق اپنی صاف گوئی بیبا کی اور خود پسندی کی بنا پر کبھی مصلحت پسند نہ رہے جس کی وجہ سے وہ خود تحریک کے اندر اور باہر اپنے حلقۂ احباب میں ہمیشہ اختلاف کا باعث بنے رہے اور جس کا اعتراف بھی ان کی جرأت مندی کی دلیل ہے وہ خود لکھتے ہیں کہ

''میں بد دماغی کی حد تک تنگ مزاج ہوں جس کی وجہ سے دشمن بنا لینے میں آسانی ہوتی ہے۔ مجھ میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اکثر بلا سوچے سمجھے زبان سے ایسی بات کہہ جاتا ہوں جو نہیں کہنا چاہیئے''

گفتنی ناگفتنی

وامق کی خودداری جوانانیت کی سرحدوں کو چھو رہی تھی جو انہیں کہیں نہ ٹکنے دیا اس لئے اپنی چلی ہوئی وکالت کے پیشے کو بھی ترک کر دیا۔ اس کے بارے میں خود رقمطراز ہیں

''قصہ مختصر لکھنؤ انجینئر بننے گیا تھا اور وہاں سے وکیل اور انقلابی بن کر نکلا دل میں ایک چنگاری دبائے ہوئے فیض آباد میں وکالت کرنے پہنچا اور شاعر بن گیا۔ وکالت کو آزاد پیشہ کہا جاتا ہے مگر میں نے اسے بہت پابند پیشہ پایا موکل کا پابند۔ محرر کا پابند عدالتوں کا پابند، اوقات کا پابند''۔

گفتنی ناگفتنی

دوران وکالت اپنے محرر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ

''ہمارے منشی جی تھے بڑے گھسے ہوئے منشی۔ منشی کم دلال زیادہ تنخواہ پسند نہ کرتے تھے انھوں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ آمدنی کا چالیس فیصد وہ لے لیا کریں گے میں نے بھی ان کی شرط بغیر کسی رود قدح کے قبول کر لی''۔

گفتنی ناگفتنی

وکالت کا پیشہ یوں بھی ان کے مزاج کے خلاف تھا اوپر سے ساری پابندیوں کا نبھانا ان جیسے

آزاد منش کے بس کی بات نہ تھی غرض وکالت چوڑ کر یو پی گورمنٹ میں محکمہ سپلائی کی خدمت پر مامور ہو گئے مگر وہاں بھی ان کی ایمانداری، خودداری اور تنگ مزاجی آڑے آئی اور وہاں سے بھی استعفاء دے کر گھر آ گئے جس کے بارے میں پوری صاف گوئی سے یوں کہتے ہیں

''بس میری اور میرے منسٹر سے پٹری نہیں کھائی یوں سمجھئے میں جو کام کرتا ہوں یہاں تک کہ نوکری میں بھی میرے جو فرائض تھے اسے انجام دینا، آپ کو معلوم ہے؟ میں جس محکمے میں تھا وہاں نیچے سے اوپر تک کرپشن تھا میں واحد شخص تھا اس محکمے کے اندر جس نے کبھی رشوت نہیں لی''۔ [1]

اس کا تذکرہ اپنی خودنوشت سوانح گفتنی ناگفتنی میں وہ اس طرح کرتے ہیں۔

''۱۹۵۰ء تک پہنچتے پہنچتے کچھ میری خفیہ سرگرمیوں کی بھنک پہنچ چکی تھی اور کچھ میری ادبی سرگرمیوں پر حکومت کا جامہ کسنے لگا تھا۔ اس لئے بارہ بنکی سے مستعفی ہو کر میں گھر چلا آیا''۔

اس طرح وہ ڈسٹرکٹ سپلائی آفیسر کی نوکری چھوڑ کر ۱۹۵۰ء میں اپنے وطن کجگاؤں آ گئے اور پھر غالباً پانچ سال بعد علی گڈھ انجینیرنگ کالج میں آفس سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے علی گڈھ آ گئے علی گڈھ کے ماحول کا وہ یوں تذکرہ کرتے ہیں۔

''وہاں میرے احباب کا حلقہ پہلے سے ہی وسیع تھا وہاں پہنچا تو سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آئے دن شعروشاعری کے جلسے اور ادبی نشستیں گرم ہونے لگیں وہ گھما گھمی تھی کہ بس لطف آ گیا۔ ہندی کے مشہور کوی نیرج جو میرے شناسا تھے ان جلسوں میں پابندی کے ساتھ میرے ہمراہ شرکت کرتے تھے اور اردو شاعری سے متاثر ہوتے تھے یہ اسی کا نتیجہ کہ آج ان کی کویتاؤں میں اردو کا

---

[1] واثق جونپوری شخص وشاعر ایس ایم عباس

نمایاں عکس ملتا ہے''۔

گفتنی ناگفتنی

لیکن علی گڈھ کی فضاؤں میں بہت جلد ان کا دم گھٹنے لگا وہاں تقریباً چھ برس گزارنے کے بعد دو سال کی رخصت بلا تنخواہ لے کر ڈپٹی رجسٹرار کے عہدہ پر ریجنل کالج سری نگر کشمیر چلے گئے اپنے علی گڈھ چھوڑنے کی وجہ وہ یوں فرماتے ہیں۔

''علی گڈھ میں چند نام نہاد شاعروں اور ادیبوں کا ایک ایسا بھی گروہ تھا جس کو وہاں میرا وجود ایک آنکھ نہ بھایا انجمن ترقی پسند مصنفین کے بڑے سرگرم کارکن تھے جس کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ اب اس کو مردہ سمجھ کر اس پر وار..... اور میں ان لوگوں میں تھا جو انجمن کے احیاء کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے مگر ارباب تحریک میں وہ نفسا نفسی اور انتشار پھیلا ہوا تھا کہ میری صدا وصدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی''۔

وامق صاحب کی خودنوشت سوانح کے بارے میں ڈاکٹر جعفر عسکری کا یہ تبصرہ انتہائی مناسب ہے اس سے وامق کے ذہنی کرب اور انتشار کا اندازہ بھی ہوتا ہے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''گفتنی ناگفتنی کو موٹے طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا حصہ طربیہ نشاطیہ اور شگفتہ کہا جا سکتا ہے۔ جس سے مذکورہ سرگزشت حیات میں ایک فرحت بخش فضا کیف آور سرخوشی تر و تازگی اور انبساط کی زیریں لہریں موجزن نظر آتی ہیں خاندانی حالات بیان کرتے ہوئے اپنے وطن کجگاؤں (جونپور) اور جونپور کی علمی و ادبی اہمیت کا بکھان کرتے ہوئے طالب علمانہ و پیشہ ورانہ زندگی کے حوالے سے بعض دلچسپ واقعات دیرینہ احباب اور پسندیدہ مقامات وشخصیات کے تذکرے میں ادبی زندگی کے آغاز مشاعروں میں شرکت کا احوال بیان کرتے ہوئے وامق وفور جذبات سے مغلوب

نظر آتے ہیں اس حصے میں شگفتہ بیانی و دلکش اسلوب نگارش جدت فکر اور رفعت تخیل کے کامیاب نمونے نظر آتے ہیں کتاب کے اس حصے کے افسانوی فضا اور مصورانہ رنگ آمیزی نے اسے دلکشی عطا کی ہے۔ [1]

نیا دور جونپور ۱۹۹۹ء

اور پہلے حصہ کے چند نمونے پچھلے صفحات پر پیش کئے جا چکے ہیں اب دوسرے چند جھلکیاں بھی دیکھیں جس میں ان اندرونی حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''فی زمانہ ایسے ادیبوں بالخصوص شاعری میں ایسے نام نہاد عہد یداروں کی کمی نہیں ہے جو کہتے تو اپنے کو ترقی پسند ہیں مگر برائے نام بھی ان کے کلام میں ترقی پسندی کا کوئی عنصر نہیں ملتا، وہ اپنی بے مقصد اور زیادہ مہمل شاعری کی مدد سے مختلف الخیال اداروں میں بے ضرر اور قابل اعتماد مانے جاتے ہیں ان کے کلام میں ''کاورس'' نام کی کوئی چیز بھی نہیں ملتی''

گفتنی ناگفتنی

''جب شعور میں جانے لگتے ہیں تو اعمال میں تضاد پیدا ہونے لگتے ہیں قابل غور یہ امر ہے کہ ادھر دہلی میں Writerfede ration of progressive موجود ہے مگر جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے کہ مرکزی .P.W.A ہے کہاں اب تو اس کا نام .F.P.W پڑ چکا ہے۔ یہ سب گھپلے عمداً کئے جاتے ہیں کہ موقع پرستی کی دوڑ ہاتھ سے جانے نہ پائے''

گفتنی ناگفتنی

اپنے ایک سیمینار جس کا عنوان تھا ''وامق جونپوری کی شخصیت اور شاعری کے توسط سے اردو ہندی ترقی پسند شاعری پر گفتگو کا ذکر یوں کرتے ہیں

''بحث میں بڑی گر ما گرمی تھی دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور سب تقریروں اور تحریروں کی تان اس نکتہ پر ٹوٹی کہ وامق جونپوری کے ساتھ نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے دیانت داری سے کام نہیں لیا اور مجرمانہ غیر ذمہ داری اور سطحیت کا ثبوت دیا ہے وامق جونپوری جس ادبی حیثیت اور بلند مقام کے مستحق تھے ان کے اعتراف میں جاہلانہ خسّت سے کام لیا گیا ہے۔ جب کہ ترقی پسند شاعروں میں ان کی تخلیقات خدمات اور اضافے اگر سب سے زیادہ نہیں ہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہیں اور ان کی عظیم ادبی حیثیت ان سے بہت پست درجے کے ادیبوں میں بانٹ دی گئی''۔

گفتنی ناگفتنی

ایک جگہ ان کا سردار جعفریؒ پر تبصرہ ان کی آتش مزاجی کا پتہ دیتا ہے لیکن کچھ حقائق سے پردہ بھی اٹھاتا ہے۔

''مزید برآں ان واقعات کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالنے کے لئے اور سردار جعفری کا جائزہ لینے کے لئے ان کو تین رخ سے دیکھنا ہوگا جو لوگ سردار کو جانتے ہیں پہچانتے ہیں ان کو میری بات ماننے میں ذرا بھی پس وپیش نہ ہوگا اور جو سردار کو کم جانتے ہیں دور سے جانتے ہیں یا نہیں جانتے وہ بخوبی ذہن نشین کر لیں کہ بحیثیت شاعر ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اپنی شاعری کے متعلق وہ عدم تیقن کے شکار ہیں وہ کسی اچھے شاعر کو ترقی کرتا ہوا اور ادب میں خاص مقام پیدا کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے حد تو یہ ہے کہ وہ فیضؔ اقبالؔ کو ایک مدت تک بڑا شاعر ماننے کو تیار نہ تھے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک اقبال کے خلاف ایک بڑا مقالہ لئے گھوما کرتے تھے۔ فیض کے متعلق انھوں نے مجھ سے خود کہا تھا کہ وہ

دوئم درجے کے شاعر ہیں اور چند چلتی ہوئی بحروں میں نظمیں اور غزلیں کہتے ہیں انھوں نے ان چند کے نام اور تقطیع بھی گنوائی تھیں جو مجھ کو اس وقت یاد نہیں بحیثیت اردو کے ایک ادیب کے ان کا مطالعہ کم ہے مگر جو ہے وہ بہت ٹھوس ہے اقتباسات ان کو بہت یاد ہیں عالمی ادب کا مطالعہ بھی اچھا ہے اور اپنے کام کی باتیں اس میں سے مستعار لیتے ہیں۔ وہ اچھے مقرر ان معنوں میں ہیں کہ اپنی بات منوانے پر ان کو بہت ملکہ ہے۔ مقالموں کے بادشاہ ہیں تیسرے بحیثیت ترقی پسند تحریک کے ایک سربراہ کے شاعروں کے معاملہ مین ان کا رویہ اور برتاؤ معرض بحث میں نہیں آ سکتا جس کی جڑ ان کی پہلی حیثیت سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ ایک شکی مزاج کے شاعر ہیں وہ کیفی اعظمی کو ایک (Second fiddle) کی حیثیت سے اس لئے برداشت کر لیتے ہیں کہ کیفی بالطبع ایک صلح پسند انسان ہیں اور سردار کو دوستی یا خوف کی وجہ سے آج کا سب سے بڑا شاعر ماننے کو تیار ہیں سردار اسی کو ادیب گردانتے ہیں جس کو وہ کسی نہ کسی طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔''

گفتنی ناگفتنی

وامق صاحب اپنے علی گڈھ سے کشمیر جانے اور وہاں کے قیام وشب وروز کے مشغلہ پر یوں تحریر کرتے ہیں

'' ڈاکٹر ذکی الدین پرنسپل ریجنل انجینیر نگ کالج سری نگر نے ڈاکٹر رئیس احمد کے اصرار پر مجھ کو کشمیر بلا لیا وہاں مزید ذہنی اور اقتصادی فراغت ملی کچھ مدت بعد ڈاکٹر اظہار حسین نے شعر گوئی پر دوبارہ اکسایا مگر وہاں بھی شعر کہنے کے لئے کم ہی وقت مل پاتا تھا۔ کالج سے فرصت پا کر تاش (برج) سے کب فرصت ملتی تھی کہ شعر کہا جائے غرض کہ زندگی کے ایام بے فکری کے ساتھ کٹتے رہے اور میں

اس نتیجے پر پہنچا کہ کشمیر تفریح کہ جگہ ہے نوکری کرنے کی نہیں۔نوکری سے ریٹائر ہوکر نومبر ۱۹۶۹ء میں کشمیر سے اپنے وطن کجگاؤں آ گیا جونپور واپس آنے کے بعد بہت سے اشعار غزلیں اور نظمیں کہنے کے بعد میں نے دو بڑی فکر انگیز نظمیں کہیں ایک ''وقت'' اور دوسری ''سفر نا تمام'' جنھوں نے اردو اور ہندی کے نئے ادیبوں اور نقادوں کو چونکا دیا۔تب انھوں نے میری پہلے کی تخلیقات میں مجھ کو تلاش کرنا شروع کر دیا''۔

گفتنی ناگفتنی

وامق نے اپنی سوانح سرگزشت میں اسلوب،صنعت گری، دل کشی جرأت مندی و بیبا کی کا جس طرح مرقع پیش کیا ہے بلا شبہ اسے اردو کے نثری ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے بقول ڈاکٹر جعفر عسکری ۔

''بہر حال وامق جونپوری کی خودنوشت سوانح حیات ''گفتنی ناگفتنی'' عہد حاضر میں لکھی جانے والی خودنوشتوں میں انفرادی حیثیت کی حامل ہے اسے ادب کے ایک زریں دور کے عروج وزوال کی دل کش اور مستند تاریخی دستاویز کہنا غلط نہ ہوگا''

باب ہشتم

اردو ادب میں وامق کا مقام

اردو ادب میں وامق کا مقام

وامق جونپوری نے ایک لمبی عمر پائی (۱۹۰۹ء ۱۹۹۸ء) جس میں ان کی ادبی کاوشوں کی عمر بھی کافی لمبی ہے۔یعنی وہ قریب ۱۹۴۰ء سے آخری وقت تک یعنی ۱۹۹۸ء تک اردو ادب کی خدمت کرتے رہے یعنی قریب اٹھاون سال۔اتنی لمبی مدت میں اگر ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً وہ بہت کم نظر آتا ہے۔اس کی وجہیں مختلف ہیں اول تو خوب سے خوب تر کی عادت نے ان کے قلم کو روکا دوسرے ان کی تنگ مزاجی وخودداری نے انھیں ہر ادبی مجالس سے روکا تیسرے ان کے مختلف شوق جیسے شکار، باغبانی، مگس رانی نے ان کا دامن کھینچا اور چوتھے ریٹائر ہونے کے بعد قریب تیس سال تک اپنے گاؤں میں عوامی زندگی ومسائل سے دلچسپی کے باعث وابستگی نے انہیں بسیار گوئی سے روکا، ویسے بھی وہ مزاجاً بسیار گوئی کے قائل نہ تھے۔ان کا عقیدہ تھا کہ با مقصد ایک شعر کے بدلے بے مقصد شاعری کا ایک دیوان دیا جا سکتا ہے انھیں سب اسباب کی بنا پر بلا شبہ ان کا ادبی ذخیرہ کم تو کہا جا سکتا ہے مگر وامق کو غیر میعاری باتیں تصنع، مبالغہ آرائی اور نام ونمود سے ہمیشہ نفرت رہی اپنی مقصد براری کے لئے انھوں نے کبھی غلط ذرائع کا استعمال نہیں کیا اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ کم صلاحیت لوگ بھی اپنی خوشامدانہ چرب زبانی اور موقع پرستی سے فائدہ اٹھا کر شہرت حاصل کرتے ہیں اور با صلاحیت لوگوں کے مقابلہ میں فائدہ اٹھاتے جاتے ہیں۔مگر جو لوگ فطرتاً با صلاحیت غیور اور خوددار پیدا ہوتے ہیں وہ مواقع ملنے پر بھی نہ اس کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ایسا نہیں کہ وامق کے پاس وسائل وذرائع نہیں تھے بلا شبہ ایسے مواقع ان کو حاصل تھے کہ وہ ان کا جائز اور ناجائز استعمال کرتے کہیں سے کہیں پہنچ سکتے تھے لیکن وامق نے ایسے ذرائع کبھی نہیں اپنائے کہ

جس سے ان کے عوام اور خود ان کا ضمیر ان کو زندگی بھر ملامت کرتا رہے۔

گو وامق اور ان کے چاہنے والوں کو یہ احساس ہے کہ ادب میں ان کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے لیکن وہ اس بات سے خوش اور مطمئن تھے کہ انھوں نے اپنے ضمیر کو کسی آلودگی میں ملوث ہونے نہیں دیا اور نہ کبھی اپنے فن کا سودا کیا۔ ڈاکٹر سید فضل امام نے اپنے ایک تبصرے میں بجا تو پر فرمایا تھا کہ

''حضرت وامق جونپوری بجا طور پر ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے واقعی خون دل سے شعر وسخن کی مشاطگی میں انتہائی خشوع وخضوع سے منہمک رہے وہ دنیوی حرص وطمع سے بے نیاز رہے اور یہی بے نیازی ان کی منفرد شان وعظمت کا نشان ہے۔''

فن اور فنکار کے بارے میں خود وامق مرحوم کس نظریے کے قائل تھے یہ ان کے مختلف مقالات۔تبصروں اور مقالات سے دیکھے جاسکتے ہیں۔شفیق جونپوری شخصیت اور فن میں وہ اپنے نظرئے کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

''حواس خمسہ کے علاوہ غیر معمولی ذہن کے انسان میں ایک صلاحیت اور ہوتی ہے جس کو چھٹی حس کہتے ہیں فن کار میں یہ چھٹی حس جتنی تیز ہوگی اتنی ہی اس میں تخلیقی قوت اور پیغمبرانہ شان زیادہ پائی جائے گی اس چھٹی حس سے پیش بینی (For sight) کی شعائیں پھوٹتی ہیں جو فکری شاعری کا سرچشمہ ہوتی ہیں اور شاعری کو ''جزویست از پیغمبری'' کا مصداق بناتی ہیں اور یہیں سے شاعر اور فلسفی کا فرق مٹنے لگتا ہے فن کار کی شخصیت میں شاعر کے پاؤں زمین میں رہتے ہیں اور اس میں فلسفی اور مفکر کی نظریں جس کو وجدان کہتے ہیں ماورائیت میں پرواز کرتی ہیں'' [۱]

وامق ایک فنکار کے قوت تخیل اور وسعت نظر کے بارے میں یوں فرماتے ہیں

''فنکار کی نظریں اونچی سے اونچی اور موٹی سے موٹی فیصلوں کو توڑ کر اور طویل فاصلوں کو طے کر کے وہ سب کچھ دیکھ لیتی ہے جس کی انھیں تلاش ہوتی ہے۔ اور جو عام انسان کو نظر نہیں آتا فن کار کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن وہ خود معدوم ہو جاتا ہے مگر اس کی تخلیقات باقی رہتی ہیں اور اس کا ذکر زندہ رہتا ہے۔'' ۲

اپنے انہیں نظریات اور افکار میں کھوئے وامق جونپوری ستائش وصلہ سے بے پرواہ ادب کی خدمت کرتے رہے، اپنی صاف گوئی اور بیباکی کی وجہ سے وہ اپنے ادیب، مداحوں کا کوئی بڑا حلقہ بھی بنا نہیں پائے لیکن اس میں کسی کو کلام نہیں کہ وہ ایک عوامی شاعر و ادیب تھے اور جہاں رہے ہمیشہ عوامی مسائل ان کے سامنے رہے اس کے حل کے لئے ہمیشہ زبانی نہیں عملی طور پر کوشاں رہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی بھر اپنے سامعین اور اپنے عوام سے قریب تر رہے بلکہ آج بھی ان کے وطن کجگاؤں اور مضافات کے لوگ جو انھیں پیار سے صرف صاحب کے نام سے پکارتے ہیں۔ انھیں یاد کر کے اپنی آنکھوں کو پرنم کر لیتے ہیں۔

وامق کے ادبی تخلیقات کی کمی محسوس ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ قریب قریب انھوں نے سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ یوں تو وہ نظم کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور ہیں مگر انھوں نے نظم و غزل کے علاوہ رباعیاں مرثیے، لوک گیت، کجری اور بجرے تک میں اپنی قلم کے جوہر دکھائے ہیں اسی طرح نثر میں جہاں انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات گفتنی ناگفتنی کے نام سے لکھی وہیں مختلف موضوعات پر مضامین لکھے جو جنرل جیسے پرچوں میں شائع ہوئے اور کشمیر ریڈیو پر نشر بھی ہوئے اس کے لئے مختلف مقالات، تبصرے، تنقیدیں اور دیباچے بھی لکھے جو منتشر ہیں اگر ان کو اکھٹا کر کے کتابی شکل دی جائے تو ان کی تخلیقات میں بیش بہا اضافہ ہو سکتا ہے عنبر بہرائچی نے ان

کے فن پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

''انھوں نے اپنی فطری بے نیازی کو ہی سچے فنکار کا شعار سمجھا اور ان کی یہ سوچ غلط بھی نہیں تھی کہ ایک تخلیقی فن کار دنیا داری سے ہمیشہ دور رہتا ہے یہی سبب ہے کہ ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد انھوں نے کجگاؤں کی معصوم فضاؤں کو ہی اپنا مستقر بنایا۔ ورنہ ان کی شاعری میں اتنا دم ہے کہ وہ اپنے زمانہ شناس ہم عصروں کے آگے بلند قامت نظر آتے ہیں اگر چہ ان کی شاعری کا سرمایہ قلیل ہے مگر ان کے ہم عصروں میں شاعری کے میدان میں ان کا کوئی ہمسر ہے بھی تو وہ منظر سلیم کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا مگر انھیں بھی نظر انداز کیا گیا کیونکہ وہ بھی قلندرانہ بے نیازی والے فنکار تھے ان دونوں کی تخلیقی اپج دیگر ہم عصروں کی بہ نسبت زیادہ مضبوط اور زرخیز تھی .....

ٹھیک ویسے ہی جیسے فیض احمد فیضؔ کی سوفسطائی دنیا داری کے آگے مجروح سلطان پوری کو اہمیت نہیں دی گئی کیونکہ مجروح نے بھی اپنی کج کلاہی کی آن بان باقی رکھی۔ یہ الگ بات ہے کہ مجروح کی غزل فیض کی غزل سے بہتر ہے۔

وامق اردو کے تعلق سے لگائے جانے والے بازاروں اور میلے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور مجبوری میں اگر وہ کہیں شامل بھی ہوئے تو وہاں انھوں نے اپنے ہم عصروں کی طرح رعونت زدہ معصومیت کا کبھی مظاہرہ نہیں کیا۔ نہ ہی کبھی انھوں نے سیاسی آقاؤں کی حاشیہ برداری کی اور نہ ہی انھوں نے اپنی کاوشوں سے زیادہ پانے کی کوشش کی۔ انھیں زمین سے لگاؤ تھا۔ اس لئے وہ خود ساختہ بے نام فضاؤں میں گل وگشت کرنے کے متمنی کبھی نہیں رہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر ان کی تخلیق میں جان ہے تو اس کی پذیرائی ضرور ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ ہمیشہ سے ذہنی تحفظات سے بڑھے ہوئے ہمارے تنقیدی ماحول کا کشف دھواں مستقبل میں ایک دن ضرور صاف ہوگا اور آنے والا نقاد میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے علاوہ ان کے ہم عصروں دوسرے معتبر تخلیق کاروں کے کارناموں پر بھی اپنے بے لاگ تبصرے ضرور پیش کرے گا۔ اور تب وامق صاحب کی عظمتوں کے صحیح خدوخال بھی ابھر کر ہمارے سامنے آئیں گے'' [۱]

وامقؔ واقعی پوری زندگی اپنی فکر اپنی سوچ اپنے نظرئے اور اپنے بنائے ہوئے راستے پر بے پروا چلتے رہے علی احمد فاطمی کا وامق کے سلسلے میں یہ تبصرہ بھی وامق کی بیان کردہ صفات کی تائید کرتا ہے۔

''ہر چند کہ وامقؔ میں اس حد تک تو یہ بات نہ تھی لیکن یہ بھی نہ تھا کہ وہ بعض دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرح محض ایک رومانی کرب میں مبتلا ہوں اور ان کے محبت میں کیف ہو نہ اثر وامق ان شعراء میں نہ تھے اس کے برعکس انھوں نے زندگی اور عوام کو آزادی فطرت، غریبی اور مفلسی کے حوالوں سے دیکھا اور اس مخصوص رومانی کرب کو ایک نئی جہت اور معنویت عطا کی اور اپنی شاعری کے کنبوس کو مختلف انداز سے بکھیر دیا کچھ اور ہی انداز سے حب الوطنی اور انسان [illegible]

آہن نہیں ہوں چاہے جدھر موڑ دیجئے　　شیشہ ہوں جھک تو سکتا نہیں توڑ دیجئے [۲]

وامق اپنی ابتدا سے عوام سے قریب تر رہے اس کے لئے انھوں نے اپنی خاندانی انانیت کو خیر باد کہا ان کے اپنے ان کے اس روئے پر چیں بہ جبیں بھی ہوئے مگر انھوں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی

---

۱ عنبر بہرائچی - وامق کی لوک شاعری - نیا دور ۱۹۹۹ء ص ۱۶

۲ علی احمد فاطمی عوام شاعری اور وامق - نیا دور جون ۱۹۹۹ء ص ۲۱

اور آخری سانس تک اپنی اس روش میں معمولی سی تبدیلی بھی گوارہ نہ کی اس روش کا تذکرہ پروفیسر سید محمود الحسن صاحب یوں کرتے ہیں

''ان کا فلسفۂ حیات ہمت وحوصلہ، خلوص وصداقت اور عوام کے ارتقاء کا تصور سب کچھ نظر آتا ہے ان کے یہاں لہجے کی دلکشی بھی ہے اور سوز وگداز بھی نغمہ وترنم کی لطافت اور رنگ وصورت کی جاذبیت بھی لیکن اہم چیز یہ ہے کہ کسی جگہ وہ عوام کی بھلائی ان کی ترقی اور ہمدردی کے جذبات کو نظر انداز نہیں کرتے اور اسی امتیاز سے ان کو دور جدید کے عوامی شاعر کے مرتبے تک پہنچایا'' [۱]

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں کہ

''یہاں اس چیز کی طرف متوجہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اردو کے ناقدین نے ان کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیات پر زیادہ توجہ نہیں دی ان کو وہ مرتبہ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے اس کے لئے بہت سے عناصر ومحرکات ذمہ دار تھے خود وامق کو بھی اکثر یہ شکایت رہی کہ ان کو شعوری طور پر نظر انداز کیا گیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک دور میں ان کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی اس وقت اس منزل تک کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اور یہ یقین ہے کہ مستقبل میں بھی جب اردو کے عوامی شعراء کا تذکرہ ہوگا تو وامق کی امتیازی خصوصیات کے بغیر ممکن نہ ہوگا'' [۲]

وامق دیہات کے رہنے والے تھے دیہات کے سادہ لوگ اور وہاں کی بے ریا معصوم فضاؤں کو وہ دل سے چاہتے اور پیار کرتے تھے۔ دیہات کے ہونے والے ہاٹ بازاروں،

---

[۱] پروفیسر سید محمود الحسن وامی ایک عوامی فنکار نیا دور جون ۱۹۹۹ء ص ۱۱

[۲] ایضاً ص ۲۵

میلوں ٹھیلوں میں بغیر کسی لگاؤ اور بناوٹ کے شریک ہوا کرتے تھے معصوم کسانوں کے درمیان ان کو اٹھنے بیٹھنے میں عار نہ تھا وہ ان کے مسائل سے برابر دلچسپی رکھتے اور ان کے دکھ سکھ میں برابر شریک ہوتے، ساون میں لکھنے والے کجری کے میلوں میں وہ شریک ہوتے خود کجری گاتے اور جوان کجری گانے والوں کو لکھ کر دیتے تھے ان کی انھیں سب خوبیوں نے ان کو ہر طبقے کا ہیرو بنا دیا تھا جس کا اثر زبان اور محاورات اور روزمرہ کے لحاظ سے ان کو شاعری کے ہر صنف میں دیکھا جا سکتا ہے اسی بنا پر ان کو عوامی فنکار کہا جاتا ہے ان کی عوامی مقبولیت سے متاثر ہو کر اگر ان کے چند ہم عصر نقادوں نے انہیں نظر انداز کیا تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہر دور میں ایسے ناقدین پیدا ہوتے رہے ہیں جو اپنے بڑوں پر نقد و تبصرہ اپنا ادبی فریضہ سمجھتے ہیں ماضی قریب میں سردار جعفری نے بھی فیضؔ اقبالؔ کو بھی بڑا شاعر ماننے کو تیار نہیں تھے انہیں بھی اپنی معاقدانہ تنقید کا نشانہ بنایا لیکن ان کے یا دوسروں کے اس طرح کے تنقیدی جملے، فیضؔ، اقبالؔ یا دوسرے بڑے شعراء کی عظمت مجروح تو نہیں کر سکے ان کی شاعرانہ عظمت آج بھی عوام اور ادبی دنیا میں محفوظ و دائم و قائم ہے۔ ماضی بعید میں غالب جیسے جاوداں شاعر کو بھی ان کے ہم عصر تنقید نگاروں نے نہیں بخشا۔ زمانے کی ناقدری کا شکوہ غالب کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

کوئی کچھ بھی کہے لیکن یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ وامق کے ہم عصر شاعروں میں کم ہی کو ان سے آنکھ ملانے یا تبادلہ خیال کی ہمت ہوتی تھی۔ وامقؔ کے مجموعہ کلام جرس کے پیش لفظ میں سید احتشام حسین نے ان کی شاعری پر بھرپور تبصرہ کیا ہے

''جن شاعروں نے بہت تھوڑے وقت میں نام پیدا کیا ان میں وامقؔ جونپوری بھی ہیں انھوں نے سنجیدگی سے دوسری جنگ عظیم کے درمیان شاعری شروع کی

اس لئے ان پر عصری شعور کا اثر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے انھوں نے زیادہ تر سیاسی اور ترقی پسندانہ نظمیں لکھیں'' [۱]

وامق نے تحریک آزادی میں بھر پور اور بے خوف ہو کر حصہ لیا اس کے لئے انھوں نے وکالت چھوڑی نوکری ترک کی اور سب سے بڑھ کر اپنی نظموں سے نوجوانوں میں ایک تحریک پیدا کی جس سے عام جوانوں میں قربانی کا جذبہ پیدا ہوا بقول ڈاکٹر رضوان احمد صاحب۔

''وامق کی شعلہ نوائی نے تحریک آزادی میں نہ صرف یہ کہ نمایاں کردار ادا کیا بلکہ ہندوستان کے سیکڑوں زخم خوردہ عوام کے دلوں کو گرمی اور توانائی بھی بخشی مختصر یہ کہ ان کے کلام میں جذبے کی تھرتھراہٹ بھی ہے شعور کی رفعت بھی، دیوانگی بھی ہے، ہوشیاری بھی اس کے ساتھ ہی روزمرہ محاوروں کی چاشنی اور تشبیہات واستعارات کی دل آویزی بھی نمایاں ہے۔'' [۲]

بلا شبہ وامق کی نظموں نے عوام اور عوامی تحریک کو کتنا متاثر کیا اس کو سمجھنے کے لئے سید محمد عقیل رضوی کا یہ تبصرہ بھی دیکھتے چلیں جو وامق کی نظموں کے تاثر پر بھر پور روشنی ڈلتا ہے۔

''وامق کی عوامی شاعری ان کی شاعری کا ایک الگ رخ ہے ان کی نظموں میں بے حد عوامی اپیل ہے چاہے وہ بھوکا ہے بنگال بول رے ساتھی بول، یا پنجاب اور مینا بازار ہو یا وہ نظمیں جو انھوں نے گاندھی جی کے قتل پر اپنے چھوٹے سے مجموعے چیخیں میں لکھی ہیں یہ وہ نظمیں ہیں جن کی اوپری سطح، اندرونی حالات، واقعات اور محسوسات سے مل کر چلتی ہیں اور عوامی جذبات اندازے اور نفرتیں میں بھی ساتھ رہتی ہیں۔ پھر وامق کا بیانیہ بھی ان نظموں میں اپنے پورے کردار

---

[۱] اردو ادب کی تنقید تاریخ ص ۲۸۸

[۲] ڈاکٹر رضوان احمد نیا دور جون ۱۹۹۹ء ص ۴۲

اور اظہاریت اور عوامی توقعات کے ساتھ چلتا ہے یہ صورت لمحاتی ہی صحیح مگر قاری اور سامع اس بیانیہ کی گرفت سے چھوٹ نہیں پاتے جب پنجاب سے آئے مہاجرین کے درمیان وامق اپنی نظم پنجاب پڑھتے تو لاہور، گجرانوالہ، اور میانوالی کے شرنارتھیوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے یہی صورت بھوکا ہے بنگال رے ساتھ، کی بھی تھی .....[1]

آگے مزید تبصرہ نگار یوں لکھتے ہیں کہ

''یہ عجب بات ہے کہ وامق کی نظمیں ہندی والوں کے درمیان زیادہ مقبول ہیں معلوم نہیں کہ گاندھی جی کے قتل پر ہندی زبان میں کتنی نظمیں لکھی گئیں (صرف بچن جی کا ایک مرتبہ مجموعہ ''سوت کی مالا'' مجھے ملا ہے) مگر اردو میں ایک بڑا ذخیرہ ہے جس میں وامق کی نظم گل سرسید کی حیثیت رکھتی ہے بنگال پر وامق کی نظم جیسی نظمیں ہندوستان کی دوسری زبانوں میں شاید ہی لکھی گئی ہیں سنا ہے کہ اسی زمانے میں یہ نظم ممبئی اور کلکتہ کے عوام سڑکوں پر کورس کی شکل میں گاتے چلتے تھے اور یہی عوامی مقبولیت وامق کی نظموں کو تاریخ اردو ادب اور شاید ہندی میں زندہ رکھے گی۔''[2]

آخیر میں شاہ نواز قریشی ایڈیٹر نیا دور کا یہ تبصرہ بھی قابل توجہ ہے جو انھوں نے وامق مرحوم کے بعد کہی ہے کہ

''بیسویں صدی اپنے اختتام کی جانب بڑھ رہی ہے اٹھارہ مہینوں کے بعد ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو جائیں گے یہ نئی صدی بھی کچھ نئے تصورات

---

[1] سید محمد عقیل رضوی نیا دور جون ۱۹۹۹ء ص ۷

[2] ایضاً ص ۴۲

ونظریات لائے گی نئے ادبی رویوں کو جنم دے گی جو بلا شبہ پہلے سے زیادہ متوازن اور منطقی ہونگے اور تب وامق جیسے فن کاروں کی اہمیت ہم پر اور زیادہ روشن ہو سکے گی۔'' [۱]

پروفیسر سید محمود الحسن نے اپنے مضمون کے آخر میں لوگوں کی توجہ اس طرف کرائی ہے کہ

''اردو کے ناقدین نے ان کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیات پر زیادہ توجہ نہیں دی ان کو وہ مرتبہ نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کے لئے بہت سے عناصر و محرکات ذمہ دار تھے۔ خود وامق کو بھی اکثر یہ شکایت رہی کہ ان کو شعوری طور پر نظر انداز کیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک دور میں ان کو عوام میں مقبولیت حاصل تھی۔ اس وقت اس منزل تک کوئی دوسرا شاعر نہیں پہنچ سکا تھا اور یقین ہے کہ مستقبل میں بھی جب اردو کے عوامی شعراء کا تذکرہ ہوگا تو وامق کی امتیازی خصوصیات کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔

ے

کہہ رہا ہوں زباں نہ کھلواؤ
بات کے زخم کی دوا ہی نہیں [۲]

وامق کی شاعری فکر و فن کا حسین امتزاج ہے لہجے میں کافی گمبھیر پن ہے وامق کی شاعری دیر تک اور دور تک ہماری زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی ہے اور چلتی رہے گی وہ بڑے شاعر نہیں بلکہ نثر نگار بھی ہیں 'عوامی ادب' پر ان کے مقالات بڑے معلومات افزا ہیں وہ نام و نمود سے بلند ہو کر گیسوئے شعر و سخن کی مشاطگی میں انتہائی خشوع اور خضوع سے منہمک رہے یہی بے نیازی ان کی منفرد شان عظمت کا نشان ہے۔

---

[۱] شاہ نواز قریشی - ایڈیٹر نیا دور ص ۲

[۲] پروفیسر سید محمود الحسن نیا دور ۱۹۹۹ء ص ۲۵

آخر میں خود واثق کا اپنی ذات اور اپنی تخلیقات پر تبصرہ کے ساتھ اس باب کو بند کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں

''اپنی تخلیقات کی طرف سے مطمئن ہو جانا ناپیدا کنار امکانات کو جھٹلانا ہے تاہم میں بڑی حد تک اپنی تخلیقات کی طرف سے مطمئن ہوں اور اس پر بھروسہ رکھتا ہوں کہ اس میں میں نے اپنے خون کا آخری قطرہ تک لگا دیا اور اس سے زیادہ میرے بس میں نہ تھا اس کے لئے میں کسی عصری سند کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا'' [۱]

---

[۱] علی احمد فاطمی - واثق جونپوری سے گفتگو کتاب نما دسمبر ۱۹۸۹ء ص ۵۷

کتابیات

کتابیات

۱-	اردو شاعری کا سماجی پس منظر	سید اعجاز حسین	الہ آباد
۲-	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	دہلی
۳-	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	علی گڈھ
۴-	اردو شاعری اور مسائل زمانہ	ڈاکٹر ظل حسین	الہ آباد
۵-	اردو کی عشقیہ شاعری	فراقؔ گورکھپوری	الہ آباد
۶-	ادب کی تلاش	بلراج کومل	لکھنؤ
۷-	ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسین	دہلی
۸-	اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقاء	ڈاکٹر روشن اختر کاظمی	بمبئی
۹-	پریم چند کہانی کا رہنما	ڈاکٹر جعفر رضا	الہ آباد
۱۰-	پریم چند فن اور تعمیر فن	ڈاکٹر جعفر رضا	الہ آباد
۱۱-	تنقیدی جائزے	پروفیسر احتشام حسین	الہ آباد
۱۲-	تنقیدی اشارے	آل احمد سرورؔ	لکھنؤ
۱۳-	ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	علی گڈھ
۱۴-	ترقی پسند تحریک کا پچاس سالہ سفر	ڈاکٹر قمر رئیس	دہلی
۱۵-	تلخیاں	ساحرؔ لدھیانوی	دہلی
۱۶-	تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیاء جون پور	سید اقبال احمد جونپوری	ٹانڈہ
۱۷-	جدید ادب منظر اور پس منظر	سید احتشام حسین	لکھنؤ

۱۸-	جدید اردو شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	دہلی
۱۹-	جدید اردو شاعری	پروفیسر عبدالقادر سروری	
۲۰-	جمہوری سوسلزم	اشوک مہتا	جالندھر
۲۱-	جرس	وامق جون پوری	لکھنؤ
۲۲-	چیخیں	وامق جون پوری	الہ آباد
۲۳-	حیات جاوید	الطاف حسین حالی	علی گڈھ
۲۴-	روشنائی	سجاد ظہیر	دہلی
۲۵-	زندگی وادب	ڈاکٹر ظل حسین	الہ آباد
۲۶-	زنداں نامہ	فیض احمد فیض	
۲۷-	سیرت سید احمد شہید	سید ابوالحسن ندوی	
۲۸-	سرور جہاں آبادی حیات اور شاعری	حکیم چند نیر	لکھنؤ
۲۹-	سفر ناتمام	وامق جون پوری	لکھنؤ
۳۰-	شب چراغ	وامق جونپوری	الہ آباد
۳۱-	شعلہ وشبنم	جوش ملیح آبادی	دہلی
۳۲-	غزل اور مطالعہ غزل	ڈاکٹر عبادت بریلوی	علی گڈھ
۳۳-	غزل انسائیکلوپیڈیا	ذکی کاکوروی	لکھنؤ
۳۴-	غزل مجروح	مجروح سلطان پوری	حیدرآباد دکن
۳۵-	غزل کے نئے جہات	پروفیسر سید محمد عقیل	دہلی
۳۶-	کیرت لتا	ودیاپتی	
۳۷-	گفتنی ناگفتنی (خودنوشت)	وامق جونپوری	زیر طباعت پٹنہ

۳۸-	لہو پکارتا ہے	سردار جعفری	دہلی
۳۹-	لانگ مارچ مقدمہ	تجمل حسین تجمل	بنگلا دیش
۴۰-	مختصر تاریخ ادب اردو	سید اعجاز حسین اور پروفیسر محمد عقیل	الہ آباد
۴۱-	مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	الہ آباد
۴۲-	مجاز حیات و شاعری	منظر سلیم	لکھنؤ
۴۳-	معنویت کی تلاش	ڈاکٹر عنوان چشتی	مظفر نگر
۴۴-	مزاج ماحول	ڈاکٹر سلام سندیلوی	لکھنؤ
۴۵-	مطالعہ و مشاہدہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی	لکھنؤ
۴۶-	ندائے آزادی	عبدالرزاق قریشی	بمبئی
۴۷-	نظم جدید کی کروٹیں	ڈاکٹر وزیر آغا	لاہور
۴۸-	نئی دنیا کو سلام	سردار جعفری	دہلی
۴۹-	نقش فریادی	فیض احمد فیض	
۵۰-	وامق جون پوری شخص اور شاعر	ایس۔ایم۔عباس	ٹانڈہ
۵۱-	ہماری شاعری	سید مسعود حسن رضوی	لکھنؤ
۵۲-	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	الہ آباد

رسائل

۱-	انقلاب	جولائی	۱۹۸۴ء	بمبئی
۲-	آج کل	اکتوبر	۱۹۸۶ء	نئی دہلی
۳-	آج کل	فروری	۱۹۹۹ء	نئی دہلی
۴-	ایوان اردو	دسمبر	۱۹۹۱ء	دریا گنج دہلی
۵-	جن مت	مارچ، اپریل	۱۹۹۲ء	پٹنہ
۶-	روح ادب	اکتوبر، نومبر، دسمبر	۱۹۸۴ء	کلکتہ
۷-	شاعر	جلد ۵۵	۱۹۹۳۰ء	بمبئی
۸-	شاعر		۱۹۸۴ء	بمبئی
۹-	شاہراہ	مئی	۱۹۵۰ء	دہلی
۱۰-	شاہراہ	نومبر	۱۹۵۰ء	دہلی
۱۱-	شاہراہ	اگست	۱۹۵۲ء	دہلی
۱۲-	شاہراہ کانفرنس نمبر	مارچ، اپریل	۱۹۵۳	دہلی
۱۳-	شہرنامہ	جنوری	۱۹۸۰ء	لکھنؤ
۱۴-	عصری ادب	جنوری، اپریل	۱۹۷۷ء	نئی دہلی
۱۵-	کتاب نما	جولائی	۱۹۸۶ء	نئی دہلی
۱۶-	نیا دور فراق نمبر ۲	مئی، جون، جولائی	۱۹۸۴ء	لکھنؤ
۱۷-	”	فروری	۱۹۸۷ء	”

۱۸-	”	مارچ تا ستمبر	۱۹۸۸ء	نیادورفراق نمبر۲
۱۹-	”	اپریل	۱۹۹۰ء	”
۲۰-	”	جنوری	۱۹۹۱ء	”
۲۱-	”	ستمبر	۱۹۹۱ء	”
۲۲-	”	اکتوبر	۱۹۹۱ء	”
۲۳-	نکہت	ستمبر	۱۹۴۸ء	الہ آباد
۲۴-	نگار	جنوری،فروری	۱۹۵۷ء	
۲۵-	نکھارادب		۱۹۸۲ء	مئوناتھ بھنجن
۲۶-	نیادور		۱۹۹۹ء	لکھنؤ